Registered No. L. 4186

۰ محرم ۱۳۶۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کیگئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، مُنکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصّہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد [illegible]، علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شُدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

فہرستِ مضامین

جلد ۳۵ | ربیع الاول، ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ مطابق جنوری، فروری ۱۹۵۱ء | عدد ۳،۴

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

پچھلی اشاعت میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا تھا کہ اگست ۱۹۴۱ء میں تحریکِ اسلامی سے متأثر ہونے والوں کی تنظیم و تربیت کا سلسلہ کس غرض کے لیے شروع ہوا تھا، کس طرح کے لوگوں کو اکٹھا کرنا مطلوب تھا، کس قسم کی تربیت ان کو دینے کی فکر تھی، اور کیا کام ان سے لینا پیشِ نظر تھا۔ ان سب امور کی توضیح جماعت کے ابتدائی دور کی مطبوعات کے حوالوں سے کی جا چکی ہے تاکہ کوئی شخص یہ شبہ نہ کر سکے کہ آج اس جماعت کے وجود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس کے مقاصد نئے سرے سے تصنیف کیے جا رہے ہیں۔ تاہم اگر اس کے بعد بھی کسی مزید توضیح کی ضرورت ہے تو ہمیں امید ہے کہ اس کے لیے وہ چند فقرے کافی ہوں گے جو تقسیم ہند سے صرف تین مہینے پہلے مئی ۱۹۴۷ء کی ایک تقریر میں کہے گئے تھے۔

یہ تقریر "بناؤ اور بگاڑ" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور ہماری مطبوعات میں موجود ہے۔ اس میں ملک کے عام اخلاقی بگاڑ اور اس کے ہولناک نتائج کا نقشہ کھینچنے کے بعد عرض کیا گیا تھا:

"اس تاریکی میں ہمارے لیے امید کی ایک ہی شعاع باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں کم از کم چار پانچ فی صدی ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو اس عام اخلاقی بگاڑ سے بچے ہوئے ہیں۔ یہ وہ سرمایہ ہے جس کو اصلاح کی ابتدا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس صالح عنصر کو چھانٹ کر منظم کیا جائے۔

ہماری بدقسمتی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بدی تو منظم ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے مگر نیکی منظم نہیں ہے ...... اب اس صورتِ حال کو ختم ہو جانا چاہیے اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک خدا کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار

ہوجائیں، تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے اندر جو صالح عناصر اس اخلاقی وبا سے بچے رہ گئے ہیں وہ اب مجتمع اور منظم ہوں اور اجتماعی طاقت سے اُس بڑھتے ہوئے فتنے کا مقابلہ کریں جو تیزی کے ساتھ ہمیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ صالح عنصر اس وقت بظاہر بہت ہی مایوس کن اقلیت میں ہے۔ یہی تھوڑے سے لوگ اگر منظم ہوجائیں، اگر ان کا اپنا ذاتی اور اجتماعی رویہ خالص راستی، انصاف، حق پسندی اور خلوص و دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو، اور اگر یہ مسائل زندگی کا ایک بہتر حل، اور دنیا کے معاملات کو درست طریقے پر چلانے کے لئے ایک اچھا پروگرام بھی رکھتے ہوں، تو یقین جانئے کہ اس منظم نیکی کے مقابلے میں منظم بدی اپنے لشکروں کی کثرت اور اپنے گندے ہتھیاروں کی تیزی کے باوجود شکست کھا کر رہے گی۔ انسانی فطرت شر پسند نہیں ہے۔ اسے دھوکا ضرور دیا جاسکتا ہے، اور ایک بڑی حد تک مسخ بھی کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے اندر بھلائی کی قدر کا جو مادہ خالق نے ودیعت کر دیا ہے اسے بالکل معدوم نہیں کیا جاسکتا ...... اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو تو لا محالہ میدان عَلَم بردارانِ شر ہی کے ہاتھ رہے گا اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبردارانِ شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخر کار اخلاق کے میدان میں ہوگا، اور اس میدان میں نیک انسانوں کو برے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ سچائی کے مقابلے میں جھوٹ، ایمانداری کے مقابلے میں بے ایمانی، اور پاکبازی کے مقابلے میں بدکرداری خواہ کتنا ہی زور لگالے، آخر جیت بہر حال سچائی، پاکبازی اور ایمانداری ہی کی ہوگی۔ دنیا اس قدر بے حس نہیں ہے کہ اچھے اخلاق کی مٹھاس اور برے اخلاق کی تلخی کا مزہ چکھ لینے کے بعد آخر کار اس کا فیصلہ مٹھاس کے خلاف تلخی کے حق میں ہو۔"

(بناؤ اور بگاڑ۔ ص ۲۷-۲۹)

پچھلے اقتباسات کے ساتھ اس آخری اقتباس کو اگر کوئی شخص بغور پڑھے گا تو ہمیں توقع ہے کہ اسے اس جماعت کی تاسیس کا مقصد اور اس کی ضرورت سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی، بشرطیکہ وہ دوسروں کی عبارتوں میں اپنے خیالات یا اپنی خواہشات پڑھنے کا مریض نہ ہو۔

اس مقصد کے لئے معاشرے کے صالح عناصر کو چھانٹنے اور ان کو ایک نظم میں پرونے کا کام ایک نہایت صبر آزما کام تھا جو کئی سال تک خاموشی کے ساتھ، اور بڑی آہستہ رفتار کے ساتھ ہوتا رہا۔ جماعت کا لٹریچر ملک کے بے شمار آدمیوں تک پہنچا۔ ان میں سے لاکھوں نے اسے اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھا۔ اُن میں سے ہزاروں آدمی کم و بیش اس سے متاثر ہوئے۔ اور ان میں سے سینکڑوں آدمیوں کے دل نے گواہی دی کہ فی الواقع یہی کرنے کا کام ہے۔ مگر یہ سینکڑوں آدمی بھی بیک وقت اس طرح جماعت کے نظم میں داخل نہیں کیے گئے کہ انھوں نے کسی رکنیت کے فارم پر دستخط کر دیئے ہوں اور بس وہ رکنِ جماعت قرار پا گئے ہوں۔ وقتاً فوقتاً تھوڑے تھوڑے آدمی یہ فیصلہ کرکے آگے بڑھتے رہے کہ اب اُن کا جینا اور مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ ان کے قول کو ان کے عمل کی گواہی سے جانچا اور پرکھا گیا کہ فی الواقع جس فیصلے کا وہ زبان سے اظہار کر رہے ہیں، ان کی عملی زندگی بھی اس کی شہادت دیتی ہے یا نہیں۔ بسا اوقات ایک ایک شخص کئی کئی مہینے تک امیدواری اور امتحان کی منزل میں رکھا گیا پھر جب اچھی طرح اطمینان کرکے اسے جماعت میں لیا گیا تو اس کے بعد بھی پوری جماعت یہ دیکھتی رہی کہ اس کے اخلاق، اس کے معاملات، اور خدا کے دین کی سربلندی کے لئے اس کی سرگرمیاں اس کم سے کم معیار کے مطابق ہیں یا نہیں جو دعوت الی الخیر کی خدمت انجام دینے کے لئے مطلوب ہے۔ جہاں کوئی شخص معیارِ مطلوب سے نیچے اترا، جماعت کے پورے نظم نے اس کو سنبھالنے اور اٹھانے کی کوشش کی، مگر جب وہ نہ اٹھ سکا تو اسے جماعت سے الگ کر دینے میں کبھی تامل نہ کیا گیا، تاکہ ایک شخص کی کمزوری پوری جماعت کو کمزور نہ کر دے۔ اس طرح ۶ سال کی طویل مدت میں ۱۰ کروڑ کی عظیم الشان قوم میں سے جو لوگ اس تنظیم کے لئے چھانٹے جا سکے ان کی تعداد تقسیم ہند کے وقت صرف ۶۲۵ تھی۔ ان لوگوں کو چھانٹنے میں جتنی خدمت جماعت کے لٹریچر نے اور جماعت کے معیارِ انتخاب نے انجام دی، ملک کے حالات نے بھی اس سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری قوم سخت ہنگامہ خیزلات میں

مبتلا تھی، اس وقت یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی ہنگامہ پسند، شہرت طلب، جاہ پرست، جوشیلا، اور جذباتی آدمی ایسی ایک خاموش اور بے لذت تحریک میں حصہ لینے کا خیال کرتا۔ اس وجہ سے ہماری دعوت کی طرف وہی لوگ کھچ کر آئے جن کے دلوں میں دینِ حق کے لئے اخلاص موجود تھا اور جن کے اندر ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا ایک نصب العین طے کرنے اور پھر اس کے لئے مدت العمر خاموشی کے ساتھ لگاتار کام کرتے رہنے کی صلاحیت تھی۔

اس طریقے سے جو لوگ معاشرے میں سے چھانٹے گئے ان کی تربیت کے لئے ہمیں کوئی خانقاہ یا تربیت گاہ قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اول روز سے ہمارا اعتماد تربیت کے اس فطری طریقے پر رہا جس سے مکے کے ابتدائی مسلمان تیار کئے گئے تھے۔ اُن کے لئے اُن کے اپنے گھر اور ان کی اپنی بستی کے کوچہ و بازار ہی تربیت گاہ تھے۔ زندگی کی آزمائشیں ہی ان کو بنانے اور نکھارنے کے لئے کافی تھیں۔ دعوتِ حق کو قبول کر کے جب انھوں نے ایک اصول کی پابندی کا فیصلہ کر لیا تو انھیں تربیت دینے کے لئے کسی جنگل یا کھوہ میں لے جانے کی ضرورت پیش نہ آئی، نہ ان کی سیرتوں کی تیاری کے لئے کوئی الگ ادارہ قائم کرنا پڑا۔ وہی معاشرہ جس کے اندر وہ رہتے تھے، ان کی زبان سے اصولِ حق کی پابندی کا اعلان سنتے ہی، اور ان کی زندگی میں اس اعلان کا اثر محسوس کرتے ہی اُن کو رگڑنے، مانجھنے اور تپا تپا کر پختہ کرنے میں لگ گیا اور اسی تربیت گاہ سے وہ لوگ تیار ہو کر نکلے جو اگرچہ مٹھی بھر تھے مگر انھوں نے چند سال کے اندر عرب کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ٹھیک یہی طریقہ تھا جس کی ہم نے تقلید کی۔ جو شخص بھی جماعت اسلامی میں داخل ہوا، اس سے بس یہ عہد لے کر چھوڑ دیا گیا کہ اب وہ اللہ رب العالمین کا مطیع فرمان اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا پیرو بن کر رہے گا اور اس مقصد کے لئے کام کرے گا کہ اللہ اور رسول کا دین دنیا میں غالب ہو کر رہے۔ اس کے بعد جو جس ماحول میں تھا وہیں اس کے لئے ایک ہمہ گیر اور ہمہ وقت تربیت گاہ کھل گئی۔ اگرچہ وہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہا تھا جس میں کسی کو بھی اللہ کی الوہیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار نہ تھا، اور کوئی بھی یہ کہنے کے لئے تیار نہ تھا کہ اسلام کے بجائے کفر دنیا میں غالب ہو، لیکن بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک شخص کو بھی اس معاشرے میں کوئی جگہ ایسی سازگار میسر نہ آئی جہاں اللہ کی عملی

اطاعت، اور نبی برحق کی عملی پیروی، اور جاہلیت کے طریقوں پر اسلامی طریقوں کی عملی ترجیح بخوشی برداشت کرلی گئی ہو۔ یہ روش اختیار کرتے ہی ہر شخص کو ہر جگہ ایک کشمکش سے سابقہ پیش آیا جس کی ابتدا اس کے اپنے نفس سے ہوئی اور پھر اس کا دائرہ ان تمام گوشوں تک پھیلتا چلا گیا جہاں اس کی اس نئی روش کا اس بگڑی ہوئی سوسائٹی کے طور طریقوں سے تصادم ہوتا تھا جو لوگ اپنی سیرت کے جس گوشے میں بھی خامی رکھتے تھے وہ اسی گوشے میں شکست کھا گئے اور اس کشمکش نے ان کو آپ ہی آپ چھانٹ کر الگ پھینک دیا۔ مگر جو ربنا اللہ کہہ کر اپنے اس قول پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے ان کے لئے یہی کشمکش ایک بہترین مربی اور مزکی ثابت ہوئی۔ اس نے ان کو صبر کی، تحمل کی، ایثار اور قربانی کی مشق کرائی۔ اس نے ان کو دھن کا پکا اور ارادے میں پختہ بنایا۔ اس نے ان میں اپنے نصب العین سے عشق اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کا ولولہ پیدا کیا۔ اس نے ان کو جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنا سکھایا۔ اس نے ان کو اس قابل بنایا کہ جس چیز کو حق سمجھیں اس کے لئے کسی خارجی دباؤ یا لالچ کے بغیر اپنے ایمان کے تقاضے سے اپنا وقت، اپنی محنتیں اور اپنے اوقات صرف کریں۔ اور اسی نے ان میں یہ طاقت پیدا کی کہ اپنے مقصد کی راہ میں نقصانات اٹھائیں، خطرات سہیں، مشکلات کا مقابلہ کریں، اور بعد کے مراحل کی شدید تر آزمائشوں کا سامنا کر سکیں۔

تربیت کے اس فطری کورس کی مدد پر تین چیزیں اور تھیں جو اس کی کسر پوری کرنے والی تھیں، ایک دعوت و تبلیغ۔ دوسرے نظم جماعت۔ اور تیسرے روح تنقید۔

دعوت و تبلیغ کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ آدمی دوسروں کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے جو اس کی عاقبت کے لئے مفید ہے، بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کی اپنی اصلاح بھی ساتھ ساتھ ہوتی جاتی ہے۔ جو شخص کسی چیز کو حق مان کر اپنی جگہ بیٹھا رہ جاتا ہے اور صرف اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے پر قانع ہو جاتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک سرمایہ لے کر گھر بیٹھ جائے اور اسی پر گزر بسر کرتا رہے ایسے شخص کا سرمایہ صرف یہی نہیں کہ بڑھتا نہیں ہے، بلکہ کام میں نہ لگنے کی وجہ سے الٹا گھٹتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بخلاف اس کے جو شخص

حق بات کو پاکر اسے پھیلانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اس کی مثال اس تاجر کی سی ہے جو اپنے سرمائے کو کاروبار میں لگا دے۔ اس طرح وہ دوسرے بہت سے لوگوں کی رزق رسانی کا موجب بھی بنتا ہے اور اس کا اپنا سرمایہ بھی یوماً فیوماً بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تبلیغِ حق کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس میں مشغول ہو اس کی اپنی ذات پر وہ حق خود بخود طاری ہوتا چلا جاتا ہے جس کی تبلیغ میں وہ سرگرم ہوتا ہے۔ اس کا چرچا کرنے، اس کی اشاعت کی راہیں تلاش کرنے اس کی تائید میں دلائل ڈھونڈنے، اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کرنے کی فکر جتنی زیادہ اس کو لاحق ہوتی ہے اسی قدر زیادہ وہ اس میں مستغرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی خاطر جب وہ طرح طرح کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرتا ہے، گالیاں سنتا ہے، طعنے سہتا ہے، الزامات اور اعتراضات برداشت کرتا ہے، اور بسا اوقات چوٹیں کھاتا اور ستایا جاتا ہے، تو یہ ساری تکلیفیں اُس حق کے ساتھ اس کے عشق کو اور زیادہ بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ پھر یہ تبلیغ اس کی تکمیل میں ایک اور طرح سے بھی مددگار ہوتی ہے جب وہ کہتا ہے کہ اپنی پوری زندگی خدا کی بندگی میں دیدو، اپنی زندگی سے تضاد اور منافقت کو دور کرو، اور جاہلیت کے ایک ایک اثر کو اپنے اندر سے نکالو، تو اس کے گرد و پیش کی دنیا میں سے سینکڑوں نگاہیں خوردبین لگا لگا کر اس کی اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیتی ہیں، اور اُس کی کوئی خامی ایسی نہیں رہ جاتی جس کی نشاندہی کرنے سے زبانیں چوک جائیں۔ اس طرح ایک آدمی کو مانجھنے اور صاف کرنے میں بہت سے بندگانِ خدا، دانستہ یا نادانستہ لگ جاتے ہیں۔ جو اپنے معترضین کی اس خدمتِ بے مزد سے فائدہ اٹھاتا ہے اُس کی تکمیل آپ سے آپ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور جو اس تنقیدِ عام سے شکست کھا کر بھاگ نکلتا ہے وہ خود ہی ثابت کر دیتا ہے کہ وہ دعوتِ حق کے کام کا آدمی نہیں ہے۔

نظمِ جماعت کے لئے ہم نے اوّل روز سے جو بات لوگوں کے ذہن نشین کی وہ یہ تھی کہ اس جماعت میں وہی شخص داخل ہو جو اس کو جانچ پرکھ کر پہلے اچھی طرح اس بات کا اطمینان کر لے کہ یہ جماعت فی الواقع اقامتِ دین کے لئے قائم ہوئی ہے اور اس کی دعوت، طریقِ کار اور اصولِ تنظیم وہی ہیں جو قرآن و سنت کے مطابق، اقامتِ دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت کے ہونے چاہئیں۔ پھر جب اس معاملے میں پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد وہ جماعت میں آئے تو اسے ٹھیک اُسی سمع و طاعت فی المعروف کا التزام کرنا چاہیئے جس کا حکم قرآن اور حدیث میں دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جماعت کے

ڈسپلن کو توڑنا محض یہی معنی نہیں رکھتا کہ آدمی نے ایک پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خود اپنے عقیدے میں جس کام کو خدا کا کام سمجھا تھا اس کو جان بوجھ کر خراب کیا اور قصداً خدا و رسول کی نافرمانی کی۔

جماعت اسلامی نے اس قاعدے کی پابندی سے پہلا فائدہ تو یہ اٹھایا کہ اس میں ایسے لوگ بہت کم داخل ہوسکے جو اس کے برحق ہونے پر مطمئن نہ ہوں اور محض کسی دماغی لہر کی وجہ سے، یا کسی عارضی کشش کے باعث جماعت کی طرف مائل ہوگئے ہوں۔ اور دوسرا فائدہ یہ اٹھایا کہ جو لوگ بھی جماعت میں آئے وہ ڈسپلن کی پابندی کے لئے کسی خارجی دباؤ کے محتاج نہ تھے۔ انھوں نے زیادہ تر خود اپنے ایمان کے تقاضے سے ڈسپلن کو قبول کیا اور انھیں باقاعدگی، نظم اور ضبط کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنانے میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہیں آئی۔ اب اگر ہمارا ڈسپلن ایک اسلامی جماعت کے معیارِ مطلوب سے کم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ایمان اُس درجہ کا نہیں ہے جیسا صحابۂ کرامؓ کا ایمان تھا۔ لیکن اس لحاظ سے اپنی ساری خامیوں کے باوجود ہم بلاشائبۂ مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی اپنے نظم و ضبط اور اپنے کارکنوں کی باقاعدگی کے اعتبار سے اس ملک کی دوسری تمام جماعتوں کے مقابلے میں نمایاں امتیاز رکھتی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو اب جماعت کے مخالفین بھی ماننے پر مجبور رہیں۔

جماعت کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح اور اس کے کارکنوں کی تربیت اور تکمیل کے لئے تیسری اہم چیز جس سے ہم نے مدد لی وہ یہ تھی کہ اول روز سے ہم نے جماعت کے اندر روحِ تنقید کو بیدار رکھنے کی کوشش کی۔ تنقید ہی وہ چیز ہے جو ہر خرابی کی بروقت نشاندہی کرتی اور اس کی اصلاح کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے لئے اخلاقی حیثیت سے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو مادی حیثیت سے صفائی کی اہمیت ہے جس طرح نجاست و طہارت کی حس مٹ جانے اور صفائی کی کوشش بند ہو جانے سے ایک بستی کا سارا ماحول گندا ہو جاتا ہے اور اس کی فضا ہر طرح کے امراض کے لئے سازگار بن جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سننے والے کان اگر بند ہو جائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہوگی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہوسکے گی۔ اس حقیقت سے ہم کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ہم نے عالمِ انسانیت کی، اپنے ملک کی اور اپنی ملت کی خرابیوں پر (بقیہ بر صفحہ ۲۵۱)

تفہیم القرآن

[یہ سلسلہ ایک مدت کے بعد اب دوبارہ ان صفحات میں شروع کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ایک مرتبہ پھر ناظرین کو اس بات سے آگاہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفہیم القرآن کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے پہلے ان صفحات میں محض مسودے کی حیثیت سے درج کیا جاتا ہے تاکہ اہلِ علم اور عام ناظرین مجھے میری غلطیوں پر مطلع فرمائیں اور اس تفسیر کو زیادہ بہتر بنانے میں مجھے مدد دیں۔ اسی لئے اس مسودے کے ساتھ قرآن مجید کا اصل متن درج نہیں کیا جا رہا ہے]

الرعد

نام آیت ۱۳ کے فقرے وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ کے لفظ الرعد کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ عنوان نہیں ہے کہ اس سورۃ میں بادل کی گرج کے مسئلے سے بحث کی گئی ہو، بلکہ یہ محض نام ہے جو علامت کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظ الرعد آیا ہے، یا جس میں رعد کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول رکوع ۴ اور رکوع ۶ کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ یہ سورۃ بھی اسی دور کی ہے جس میں سورۂ یونس، ہود، اور اعراف نازل ہوئی ہیں، یعنی زمانۂ قیام مکہ کا آخری دور۔ انداز بیان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ایک مدتِ دراز گزر چکی ہے، مخالفین آپ کو زک دینے اور آپ کے مشن کو ناکام کرنے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلتے رہے ہیں، مومنین بار بار تمنائیں کر رہے ہیں کہ کاش کوئی معجزہ دکھا کر ہی ان لوگوں کو راہِ راست پر لایا جائے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھا رہا ہے کہ ایمان کی راہ دکھانے کا یہ طریقہ ہمارے ہاں رائج نہیں ہے اور اگر دشمنانِ حق کی رسّی دراز کی جا رہی ہے تو یہ ایسی بات نہیں ہے جس سے تم گھبرا اٹھو۔ پھر آیت ۳۱ سے یہ بھی معلوم

ہوتا ہے کہ بار بار کفار کی ہٹ دھرمی کا ایسا مظاہرہ ہو چکا ہے جس کے بعد یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ اگر قبروں سے مُردے بھی اٹھ کر آجائیں تو یہ لوگ نہ مانیں گے بلکہ اس واقعہ کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر ڈالیں گے۔

ان سب باتوں سے یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون سورۃ کا مدعا پہلی ہی آیت میں پیش کر دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہی حق ہے، مگر یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ اسے نہیں مانتے۔ ساری تقریر اسی مرکزی مضمون کے گرد گھومتی ہے۔ اس سلسلے میں بار بار مختلف طریقوں سے توحید، معاد اور رسالت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے، ان پر ایمان لانے کے اخلاقی و روحانی فوائد سمجھائے گئے ہیں، ان کو نہ ماننے کے نقصانات بتائے گئے ہیں، اور یہ ذہن نشین کیا گیا ہے کہ کفر سراسر ایک حماقت اور جہالت ہے۔ پھر چونکہ اس سارے بیان کا مقصد محض دماغوں کو مطمئن کرنا ہی نہیں ہے، دلوں کو ایمان کی طرف کھینچنا بھی ہے، اس لیے نرے منطقی استدلال سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ایک ایک دلیل اور ایک ایک شہادت کو پیش کرنے کے بعد ٹھیر کر طرح طرح سے تخویف، ترہیب، ترغیب، اور مشفقانہ تلقین کی گئی ہے تاکہ نادان لوگ اپنی گمراہانہ ہٹ دھرمی سے باز آجائیں۔

دورانِ تقریر میں جگہ جگہ مخالفین کے اعتراضات کا ذکر کیے بغیر ان کے جوابات دیئے گئے ہیں، اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے تھے یا مخالفین کی طرف سے ڈالے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ اہلِ ایمان کو بھی، جو کئی برس کی طویل اور سخت جدوجہد سے تھکے جا رہے تھے اور بےچینی کے ساتھ غیبی امداد کے منتظر تھے، تسلی دی گئی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

ا۔ل۔م۔ر۔ یہ کتابِ الٰہی کی آیات ہیں، اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے

وہ عین حق ہے، مگر (تمہاری قوم کے) اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔[۵۱]

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں،[۵۲] پھر وہ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا[۵۳] اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا

---

۵۱ یہ اس سورہ کی تمہید ہے جس میں مقصودِ کلام کو چند لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور آپ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی! تمہاری قوم کے اکثر لوگ اس تعلیم کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اسے ہم نے تم پر نازل کیا ہے اور یہی حق ہے خواہ لوگ اسے مانیں یا نہ مانیں۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل تقریر شروع ہو جاتی ہے جس میں منکرین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیم کیوں حق ہے اور اس کے بارے میں ان کا رویہ کس قدر غلط ہے۔ اس تقریر کو سمجھنے کے لیے ابتدا ہی سے یہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت جس چیز کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے تھے وہ تین بنیادی باتوں پر مشتمل تھی! ایک یہ کہ خدائی پوری کی پوری اللہ کی ہے اس لیے اس کے سوا کوئی بندگی و عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تم کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ تیسرے یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور جو کچھ پیش کر رہا ہوں اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں۔ یہی تین باتیں ہیں جنہیں ماننے سے لوگ انکار کر رہے تھے، انہی کو اس تقریر میں بار بار طریقے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور انہی کے متعلق لوگوں کے شبہات و اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے۔

۵۲ یا بالفاظِ دیگر آسمانوں کو غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر قائم کیا۔ بظاہر کوئی چیز فضائے بسیط میں ایسی نہیں ہے جو ان بے حد و حساب اجرامِ فلکی کو تھامے ہوئے ہو۔ مگر ایک غیر محسوس طاقت ایسی ہے جو ہر ایک کو اس کے مقام و مدار پر روکے ہوئے ہے اور ان عظیم الشان اجسام کو زمین پر یا ایک دوسرے پر گر جانے نہیں دیتی۔

۵۳ اس کی تشریح سورۂ اعراف رکوع ۷ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔ مختصراً یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ عرش (یعنی سلطنتِ کائنات کے مرکز) پر اللہ تعالیٰ کی جلوہ فرمائی کو جگہ جگہ قرآن میں جس غرض کے لئے بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ وہ آپ ہی اس سلطنت پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ یہ جہانِ ہست و بود کوئی خود بخود چلنے والا کارخانہ نہیں ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل خیال کرتے ہیں؛ اور نہ مختلف خداؤں کی آماجگاہ ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل سمجھ بیٹھے ہیں، بلکہ یہ ایک باقاعدہ نظام ہے جسے اس کا پیدا کرنے والا خود چلا رہا ہے۔

پابند بنایا[۵۱]۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقتِ مقرر تک کے لئے چل رہی ہے[۵۲]، اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر

---

۵۱ یہاں یہ امر ملحوظ رہنا چاہئیے کہ مخاطب وہ قوم ہے جو اللہ کی ہستی کی منکر نہ تھی، نہ اس کے خالق ہونے کی منکر تھی اور نہ یہ گمان رکھتی تھی کہ یہ سارے کام جو یہاں بیان کئے جارہے ہیں، اللہ کے سوا کسی اور کے ہیں۔ اس لئے بجائے خود اس بات پر دلیل لانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ واقعی اللہ ہی نے آسمانوں کو قائم کیا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو ایک ضابطے کا پابند بنایا ہے۔ بلکہ ان واقعات کو جنھیں مخاطب بھی مانتے تھے، ایک دوسری بات پر دلیل قرار دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس نظام کائنات میں صاحبِ اقتدار نہیں ہے جو معبود قرار دیئے جانے کا مستحق ہو۔ رہا یہ سوال کہ جو شخص سرے سے اللہ کی ہستی کا اور اس کے خالق و مدبر ہونے ہی کا قائل نہ ہو اُس کے مقابلے میں یہ استدلال کیسے مفید ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کے مقابلے میں توحید کے لئے جو دلائل دیتا ہے وہی دلائل ملاحدہ کے مقابلے میں وجود باری کے اثبات کے لئے بھی کافی ہیں۔ توحید کا سارا استدلال اس بنیاد پر قائم ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور یہ پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، اور بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار جہاں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کے بہت سے فرمانروا نہیں ہیں، وہیں اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کا ایک فرمانروا ہے۔ نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر، قانون کا تصور ایک حکمران کے بغیر، حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلق کا تصور ایک خالق کے بغیر صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ہٹ دھرم ہو، یا پھر وہ جس کی عقل ماری گئی ہو۔

۵۲ یعنی یہ نظام صرف اسی امر کی شہادت نہیں دے رہا ہے کہ ایک ہمہ گیر اقتدار اس پر فرمانروا ہے اور ایک زبردست حکمت اس میں کام کر رہی ہے، بلکہ اس کے تمام اجزاء اور اُن میں کام کرنے والی ساری قوتیں اس بات پر بھی گواہ ہیں کہ اس نظام کی کوئی چیز غیر فانی نہیں ہے۔ ہر ایک کے لئے ایک وقت مقرر ہے جس کے اختتام تک وہ چیز چلتی ہے اور جب اس کا وقت آن پورا ہوتا ہے تو وہ مٹ جاتی ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اس نظام کے ایک ایک جزء کے معاملے میں صحیح ہے اسی طرح اس پورے نظام کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اس عالم طبیعی کی مجموعی ساخت یہ بتا رہی ہے کہ یہ ابدی و سرمدی نہیں ہے، اس کے لئے بھی کوئی وقت ضرور مقرر ہے جب یہ ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا عالم برپا ہوگا۔ لہٰذا قیامت، جس کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اس کا آنا مستبعد نہیں بلکہ نہ آنا مستبعد ہے۔

فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے[۵۱] شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔[۵۲]

۵۱؎ یعنی اس امر کی نشانیاں کہ رسولِ خدا جن حقیقتوں کی خبر دے رہے ہیں وہ فی الواقع سچی حقیقتیں ہیں۔ کائنات میں ہر طرف اُن پر گواہی دینے والے آثار موجود ہیں۔ اگر لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں نظر آ جائے کہ اس کتاب میں جن جن باتوں پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے زمین و آسمان میں پھیلے ہوئے بے شمار نشانات ان کی تصدیق کر رہے ہیں۔

۵۲؎ اوپر جن آثارِ کائنات کو گواہی میں پیش کیا گیا ہے اُن کی یہ شہادت تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اس عالم کا خالق و مدبّر ایک ہی ہے، لیکن یہ بات کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور عدالتِ الٰہی میں انسان کی حاضری اور جزا و سزا کے متعلق رسول اللہؐ نے جو خبریں دی ہیں ان کے برحق ہونے پر بھی یہی آثار شہادت دیتے ہیں، ذرا مخفی ہے اور زیادہ غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس لئے پہلی حقیقت پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، کیونکہ سننے والا محض دلائل کو سن کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ دوسری حقیقت پر خصوصیت کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے رب کی ملاقات کا یقین بھی تم کو انھی نشانیوں پر غور کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا نشانیوں سے آخرت کا ثبوت دو طرح سے ملتا ہے۔ ایک یہ کہ جب ہم آسمانوں کی ساخت اور شمس و قمر کی تسخیر پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل یہ شہادت دیتا ہے کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان اجرام فلکی پیدا کئے ہیں، اور جس کی قدرت اتنے بڑے بڑے کروں کو فضا میں گردش دے رہی ہے اس کے لئے نوعِ انسانی کو موت کے بعد دوبارہ پیدا کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی نظامِ فلکی سے ہم کو یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا کمال درجے کا حکیم ہے اور اس کی حکمت سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ انسان کو ایک ذی عقل و شعور اور صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق بنانے کے بعد، اور اپنی زمین کی بے شمار چیزوں پر تصرف کی قدرت عطا کرنے کے بعد اس کے کارنامۂ زندگی کا حساب نہ لے، اس کے ظالموں سے بازپرس اور اس کے مظلوموں کی دادرسی نہ کرے، اس کے نیکوکاروں کو جزا اور اس کے بدکاروں کو سزا نہ دے، اور اس سے کبھی یہ پوچھے ہی نہیں کہ جو بیش قیمت امانتیں میں نے تیرے سپرد کی تھیں ان کے ساتھ تو نے کیا معاملہ کیا۔ ایک اندھا راجہ تو بے شک اپنی سلطنت کے معاملات اپنے کارپردازوں کے حوالے کر کے خوابِ غفلت میں سرشار ہو سکتا ہے، لیکن ایک حکیم و دانا سے اِس غلط بخشی و تغافل کیشی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح آسمانوں کا مشاہدہ ہم کو نہ صرف آخرت کے امکان کا قائل کرتا ہے، بلکہ اس کے وقوع کا یقین بھی دلاتا ہے۔

اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اِس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں، اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔[۱] ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

---

[۱] اجرامِ فلکی کے بعد عالمِ ارضی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اور یہاں بھی خدا کی قدرت اور حکمت کے نشانات سے اُنھی دونوں حقیقتوں (توحید اور آخرت) پر استشہاد کیا گیا ہے جن پر پچھلی آیات میں عالمِ سماوی کے آثار سے استشہاد کیا گیا تھا۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اجرامِ فلکی کے ساتھ زمین کا تعلق، زمین کے ساتھ سورج اور چاند کا تعلق، زمین کی بےشمار مخلوقات کی ضرورتوں سے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق، یہ ساری چیزیں اس بات پر کھلی شہادت دیتی ہیں کہ ان کو نہ تو الگ الگ خداؤں نے بنایا ہے اور نہ مختلف با اختیار خدا ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان سب چیزوں میں باہم اتنی مناسبتیں اور ہم آہنگیاں اور موافقتیں نہ پیدا ہو سکتی تھیں اور نہ قائم رہ سکتی تھیں۔ الگ الگ خداؤں کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مل کر پوری کائنات کے لیے تخلیق و تدبیر کا ایسا منصوبہ بنا لیتے جس کی ہر چیز زمین سے لے کر آسمانوں تک ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کھاتی چلی جاتی اور کبھی ان کی مصلحتوں کے درمیان تصادم واقع نہ ہوتا۔

(۲) زمین کے اِس عظیم الشان کُرے کا فضائے بسیط میں معلق ہونا، اس کی سطح پر اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کا ابھر آنا، اس کے سینے پر ایسے ایسے زبردست دریاؤں کا جاری ہونا، اس کی گود میں طرح طرح کے بے حد و حساب درختوں کا چلنا، اور اس پر پیہم انتہائی باقاعدگی کے ساتھ رات اور دن کے حیرت انگیز آثار کا طاری ہونا، یہ سب چیزیں اُس خدا کی قدرت پر گواہ ہیں جس نے انھیں پیدا کیا ہے۔ ایسے قادرِ مطلق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا نہیں کر سکتا، عقل و دانش کی نہیں، حماقت و بلادت کی دلیل ہے۔

(۳) زمین کی ساخت میں، اُس پر پہاڑوں کی پیدائش میں، پہاڑوں سے دریاؤں کی روانی کا انتظام کرنے میں، پھلوں کی ہر قسم میں دو دو طرح کے پھل پیدا کرنے میں، اور رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات باقاعدگی کے ساتھ لانے میں جو بےشمار حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں وہ پکار پکار کر شہادت دے رہی ہیں کہ جس خدا نے تخلیق کا یہ نقشہ بنایا ہے وہ کمال درجے کا حکیم ہے۔ یہ ساری چیزیں خبر دیتی ہیں کہ یہ نہ تو کسی بے ارادہ طاقت کی کارفرمائی ہے اور نہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا۔ ان میں سے ہر ہر چیز کے اندر ایک حکیم کی حکمت اور انتہائی بالغ حکمت کام کرتی نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد صرف ایک نادان ہی ہو سکتا ہے جو یہ گمان کرے کہ زمین پر انسان کو پیدا کر کے اور اسے ایسی ہنگامہ آرائیوں کے مواقع دے کر وہ اس کو یونہی خاک میں گم کر دے گا۔

اور دیکھو، زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل بھی ہیں اور پھر الگ الگ بھی[۱]۔ انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے[۲]، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزے میں ہم نے کسی کو بہتر بنا دیا ہے اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں[۳]۔

---

۱ یعنی ساری زمین کو اس نے یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا ہے بلکہ اس میں بےشمار خطے پیدا کر دیئے ہیں جو متصل ہونے کے باوجود شکل میں، رنگ میں، مادۂ ترکیب میں، خاصیتوں میں، قوتوں اور صلاحیتوں میں، پیداوار اور کیمیاوی یا معدنی خزانوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان مختلف خطوں کی پیدائش اور ان کے اندر طرح طرح کے اختلافات کی موجودگی اپنے اندر اتنی حکمتیں اور مصلحتیں رکھتی ہے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ دوسری مخلوقات سے قطع نظر، صرف ایک انسان ہی کے مفاد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی مختلف اغراض و مصالح اور زمین کے ان خطوں کی گوناگونی کے درمیان جو مناسبتیں اور مطابقتیں پائی جاتی ہیں اور ان کی بدولت انسانی تمدن کو پھلنے پھولنے کے جو مواقع بہم پہنچے ہیں وہ یقیناً کسی حکیم کی فکر اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کے دانشمندانہ ارادے کا نتیجہ ہیں۔ اسے محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے کے لیے بڑی ہٹ دھرمی درکار ہے۔

۲ کھجور کے درختوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی جڑ سے ایک ہی تنا نکلتا ہے اور بعض میں ایک جڑ سے دو یا زیادہ تنے نکلتے ہیں۔

۳ اس آیت میں اللہ کی توحید اور اس کی قدرت و حکمت کے نشانات دکھانے کے علاوہ ایک اور حقیقت کی طرف بھی لطیف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے اس کائنات میں کہیں بھی یکسانی نہیں رکھی ہے۔ ایک ہی زمین ہے، مگر اس کے قطعے اپنے اپنے رنگوں، شکلوں اور خاصیتوں میں جدا ہیں۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی ہے مگر اس سے طرح طرح کے غلے اور پھل پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک ہی درخت ہے اور اس کا ہر پھل دوسرے پھل سے نوعیت میں متحد ہونے کے باوجود شکل اور جسامت اور مزے میں مختلف ہے۔ ایک ہی جڑ ہے اور اس سے دو الگ تنے نکلتے ہیں جن کے پھل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان چیزوں پر جو شخص غور کرے گا وہ اس بات پر کبھی پریشان نہ ہو گا کہ انسانی طبائع اور میلانات اور مزاجوں میں اتنا اختلاف کیوں ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر اسی سورۃ میں فرمایا گیا ہے، اگر اللہ چاہتا تو سب انسانوں کو یکساں بنا سکتا تھا، مگر جس حکمت پر اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے وہ یکسانی کی نہیں بلکہ تنوع اور رنگارنگی کی متقاضی ہے۔ سب کو یکساں بنا دینے کے بعد تو یہ سارا ہنگامۂ وجود ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا۔

اب اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے[۱]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں[۲]، یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لئے جلدی مچا رہے ہیں[۳] حالانکہ ان سے پہلے (جو لوگ اس روش پر چلے ہیں ان پر خُدا کے عذاب کی) عبرتناک مثالیں گزر چکی ہیں حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود اُن کے ساتھ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے۔

یہ لوگ جنھوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے کہتے ہیں کہ "اِس شخص پر اس کے رب کی طرف سے

۱؎ یعنی ان کا آخرت سے انکار دراصل خدا سے اور اس کی قدرت اور حکمت سے انکار ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں کہتے ہیں کہ ہمارا مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کے اسی قول میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ وہ خدا عاجز و درماندہ اور نادان و بے خرد ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

۲؎ گردن میں طوق پڑا ہونا قیدی ہونے کی علامت ہے۔ ان لوگوں کی گردنوں میں طوق پڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت کے، اپنی ہٹ دھرمی کے، اپنی خواہشاتِ نفس کے، اور اپنے آبا و اجداد کی اندھی تقلید کے اسیر بنے ہوئے ہیں۔ یہ آزادانہ غور و فکر نہیں کر سکتے۔

۳؎ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اگر تم واقعی نبی ہو اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم نے تم کو جھٹلا دیا ہے تو اب آخر ہم پر وہ عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو؟ اس کے آنے میں خواہ مخواہ دیر کیوں لگ رہی ہے؟ کبھی وہ چیلنج کے انداز میں کہتے کہ رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (خدایا ہمارا حساب تو ابھی کر دے، قیامت پر نہ اٹھا رکھ) اور کبھی کہتے کہ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (خدایا اگر یہ باتیں جو محمدؐ پیش کر رہے ہیں حق ہیں اور تیری ہی طرف سے ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب نازل کر دے) اس آیت میں کفار کی انھی باتوں کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ نادان خیر سے پہلے شر مانگتے ہیں، اللہ کی طرف سے ان کو سنبھلنے کے لئے جو مہلت دی جا رہی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مہلت کو جلدی ختم کر دیا جائے اور ان کی باغیانہ روش پر فوراً گرفت کر ڈالی جائے۔

کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟[51] ——— تم تو محض خبردار کرنے والے ہو، اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما ہے۔[52] ع

اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے۔ جو کچھ اُس میں بنتا ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔[53] ہر چیز کے لئے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے۔ وہ غیب اور شہادت[54]، ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہمیشہ ہر چیز پر بالاتر رہنے والا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص خواہ

---

[51] نشانی سے اُن کی مراد ایسی نشانی تھی جسے دیکھ کر ان کو یقین ہو جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ وہ آپ کی بات کو اُس کی حقانیت کے دلائل سے سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ آپ کی سیرتِ پاک سے سبق لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ اُس زبردست اخلاقی انقلاب سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو آپ کی تعلیم کے اثر سے آپ کے صحابہ کی زندگیوں میں رونما ہو رہا تھا۔ وہ اُن معقول دلائل پر بھی غور کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو ان کے مشرکانہ مذہب اور ان کے اوہامِ جاہلیت کی غلطیاں واضح کرنے کے لئے قرآن میں پیش کیے جا رہے تھے۔ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر وہ چاہتے تھے کہ انھیں کوئی کرشمہ دکھایا جائے جس کے معیار پر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جانچ سکیں۔

[52] یہ ان کے مطالبہ کا مختصر سا جواب ہے جو براہِ راست ان کو دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی تم اس فکر میں نہ پڑو کہ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے آخر کونسا کرشمہ دکھایا جائے۔ تمہارا کام ہر ایک کو مطمئن کر دینا نہیں ہے۔ تمہارا کام تو صرف یہ ہے کہ خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو چونکا دو اور ان کو غلط روی کے بُرے انجام سے خبردار کر دو۔ یہ خدمت ہم نے ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ایک نہ ایک ہادی کو مقرر کر کے لی ہے، اب تم سے بھی یہی خدمت لے رہے ہیں! اس کے بعد جس کا جی چاہے آنکھیں کھولے اور جس کا جی چاہے غفلت میں پڑا رہے۔ یہ مختصر جواب دے کر اللہ تعالیٰ ان کے مطالبے کی طرف سے رخ پھیر لیتا ہے اور ان کو متنبہ کرتا ہے کہ تم کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہو جہاں کسی چوپٹ راجہ کا راج ہو۔ تمہارا واسطہ ایک ایسے خدا سے ہے جو تم میں سے ایک ایک شخص کو اس وقت سے جانتا ہے جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بن رہے تھے، اور زندگی بھر تمہاری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاں تمہاری قسمتوں کا فیصلہ ٹھیٹھ عدل کے ساتھ تمہارے اوصاف کے لحاظ سے ہوتا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔

[53] اس سے مراد یہ ہے کہ ماؤں کے رحم میں بچے کے اعضاء اس کی قوتوں اور قابلیتوں، اور اس کی صلاحیتوں اور استعدادوں میں جو کچھ کمی یا زیادتی ہوتی ہے اللہ کی براہِ راست نگرانی میں ہوتی ہے۔

[54] غیب = وہ سب کچھ جو انسانوں کے حواس سے پوشیدہ ہے۔

شہادت = وہ سب کچھ جو انسانوں کو معلوم ہے اور جسے انسان اپنے حواس سے محسوس کر رہے ہیں۔

زور سے بات کرے یا آہستہ، اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو، اس کے لئے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کئے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔[۱۹] حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی! اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔[۲۰]

وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں۔ وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ بادلوں کی گرج اُس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے[۲۱] اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں۔[۲۲] وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور (بسا اوقات)

---

۱۹ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ہر حال میں براہِ راست خود دیکھ رہا ہے اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے واقف ہے، بلکہ مزید برآں اللہ کے مقرر کئے ہوئے نگران کار بھی ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور اس کے پورے کارنامۂ زندگی کا ریکارڈ محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایسے خدا کی خدائی میں جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں کہ انہیں شترِ بے مہار کی طرح زمین پر چھوڑ دیا گیا ہے اور کوئی نہیں جس کے سامنے وہ اپنے نامۂ اعمال کے لئے جواب دہ ہوں، وہ دراصل اپنی شامت آپ بلاتے ہیں۔

۲۰ یعنی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہو کہ اللہ کے ہاں کوئی پیر یا فقیر، یا کوئی اگلا پچھلا بزرگ، یا کوئی جن یا فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ تم خواہ کچھ ہی کرتے رہو، وہ تمہاری نذروں اور نیازوں کی رشوت لے کر تمہیں تمہارے برے اعمال کی پاداش سے بچا لے گا۔

۲۱ یعنی بادلوں کی گرج یہ ظاہر کرتی ہے کہ جس خدا نے یہ ہوائیں چلائیں، یہ بھاپیں اٹھائیں، یہ کثیف بادل جمع کیے، اس بجلی کو بارش کا ذریعہ بنایا اور اس طرح زمین کی مخلوقات کے لئے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا، وہ سبوح و قدوس ہے، اپنی حکمت اور قدرت میں کامل ہے، اپنی صفات میں بے عیب ہے، اور اپنی خدائی میں لاشریک ہے۔ جانوروں کی طرح سننے والے تو ان بادلوں میں صرف گرج کی آواز ہی سنتے ہیں۔ مگر جو ہوش کے کان رکھتے ہیں وہ بادلوں کی زبان سے توحید کا یہ اعلان سنتے ہیں۔

۲۲ فرشتوں کے جلالِ خداوندی سے لرزنے اور تسبیح کرنے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ یہاں اس لئے کیا کہ مشرکین ہر زمانے میں فرشتوں کو دیوتا اور معبود قرار دیتے رہے ہیں اور ان کا یہ گمان رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی خدائی میں شریک ہیں۔ اس غلط خیال کی تردید کے لئے فرمایا گیا کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں خدا کے شریک نہیں ہیں بلکہ فرمانبردار خادم ہیں اور اپنے آقا کے جلال سے کانپتے ہوئے اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔

انھیں جس پر چاہتا ہے عین اُس حالت میں گرا دیتا ہے جبکہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ فی الواقع اُس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔

اسی کو پکارنا برحق ہے[۱]۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنھیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ اُنھیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا، حالانکہ پانی اُس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیرِ بے ہدف! وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے[۲] اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں[۳]۔

ان سے پوچھو، آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ ——— کہو، اللہ[۴]۔ پھر ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیا

---

[۱] پکارنے سے مراد اپنی حاجتوں میں مدد کے لئے پکارنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حاجت روائی و مشکل کشائی کے سارے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں، اس لئے صرف اُسی سے دعائیں مانگنا برحق ہے۔

[۲] سجدے سے مراد اطاعت میں جھکنا، حکم بجا لانا اور سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر مخلوق اس معنی میں اللہ کو سجدہ کر رہی ہے کہ وہ اس کے قانون کی مطیع ہے اور اس کی مشیت سے بال برابر بھی سرتابی نہیں کر سکتی۔ مومن اسے برضا و رغبت سجدہ کرتا ہے تو کافر کو مجبوراً کرنا پڑتا ہے، کیونکہ خدا کے قانونِ فطرت سے ہٹنا اس کی مقدرت سے باہر ہے۔

[۳] سایوں کے سجدہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اشیاء کے سایوں کا صبح و شام مغرب اور مشرق کی طرف گرنا اس بات کی علامت ہے کہ یہ سب چیزیں کسی کے امر کی مطیع اور کسی کے قانون سے مسخر ہیں۔

[۴] واضح رہے کہ وہ لوگ خود اس بات کے قائل تھے کہ زمین و آسمان کا رب اللہ ہے۔ وہ اس سوال کا جواب انکار کی صورت میں نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ یہ انکار خود ان کے اپنے عقیدے کے خلاف تھا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر وہ اقرار کی صورت میں بھی اس کا جواب دینے سے کتراتے تھے، کیونکہ اس اقرار کے بعد توحید کا ماننا لازم آجاتا تھا اور شرک کے لیے کوئی معقول بنیاد باقی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے اپنے موقف کی کمزوری کو محسوس کر کے وہ اس سوال کے جواب میں چپ سادھ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان سے پوچھو زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ کائنات کا رب کون ہے؟ تم کو رزق دینے والا کون ہے؟ پھر حکم دیتا ہے کہ تم خود کہو کہ اللہ۔ اور اس کے بعد یوں استدلال کرتا ہے کہ جب یہ سارے کام اللہ کے ہیں تو آخر یہ دوسرے کون ہیں جن کی تم بندگی کئے جا رہے ہو۔

تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھیرا یا ہے جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ؟ کہو، کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے[۵۱] ؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں[۵۲] ؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا[۵۳] ؟

---

۵۱ اندھے سے مراد وہ شخص ہے جس کے آگے کائنات میں ہر طرف اللہ کی وحدانیت کے آثار و شواہد پھیلے ہوئے ہیں مگر وہ ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ اور آنکھوں والے سے مراد وہ ہے جس کے لیے کائنات کے ذرّے ذرّے اور پتّے پتّے میں معرفتِ کردگار کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ عقل کے اندھو! اگر تمہیں کچھ نہیں سوجھتا تو آخر چشم بینا رکھنے والا اپنی آنکھیں کیسے پھوڑ لے؟ جو شخص حقیقت کو آشکار دیکھ رہا ہے اس کے لئے کس طرح ممکن ہے کہ بے بصیرت لوگوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا پھرے ؟

۵۲ روشنی سے مراد علم حق کی وہ روشنی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو حاصل تھی۔ اور تاریکیوں سے مراد جہالت کی وہ تاریکیاں ہیں جن میں منکرین بھٹک رہے تھے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ جس کو روشنی مل چکی ہے وہ کس طرح اپنی شمع بجھا کر اندھیروں میں ٹھوکریں کھانا قبول کر سکتا ہے؟ تم اگر نور کے قدر شناس نہیں ہو تو نہ سہی۔ لیکن جس نے اسے پالیا ہے، جو نور و ظلمت کے فرق کو جان چکا ہے، جو دن کے اجالے میں راہ راست کو صاف دیکھ رہا ہے، وہ روشنی کو چھوڑ کر تاریکیوں میں بھٹکتے پھرنے کے لیے کیسے آمادہ ہو سکتا ہے ؟

۵۳ اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا میں کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہوتیں اور کچھ دوسروں نے، اور یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا کہ خدا کا تخلیقی کام کونسا ہے اور دوسروں کا کونسا، تب تو واقعی شرک کے لیے کوئی معقول بنیاد ہو سکتی تھی۔ لیکن جب یہ مشرکین خود مانتے ہیں کہ ان کے معبودوں میں سے کسی نے ایک تنکا اور ایک بال تک پیدا نہیں کیا ہے، اور جب انھیں خود تسلیم ہے کہ خلق میں ان جعلی خداؤں کا ذرّہ برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہے، تو پھر یہ خالق کے اختیارات اور اس کے حقوق میں آخر کس بنا پر شریک ٹھیرا لیے گئے ؟

——— کہو، ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب![ف۱]

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا، پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے[ف۲]۔ اور ایسے ہی جھاگ اُن چیزوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں[ف۳]۔ اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔

ف۱ اصل میں لفظ قہّار استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "وہ ہستی جو اپنے زور سے سب پر حکم چلائے اور سب کو مغلوب کر کے رکھے"۔ یہ بات کہ "اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے" مشرکین کی اپنی تسلیم کردہ حقیقت ہے جس سے انہیں کبھی انکار نہ تھا۔ اور یہ بات کہ "وہ یکتا اور قہّار ہے" اس تسلیم شدہ حقیقت کا لازمی نتیجہ ہے جس سے انکار کرنا، پہلی حقیقت کو مان لینے کے بعد کسی صاحبِ عقل کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو ہر چیز کا خالق ہے، وہ لامحالہ یکتا و یگانہ ہے، کیونکہ دوسری جو چیز بھی ہے وہ اسی کی مخلوق ہے، پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مخلوق اپنے خالق کی ذات، یا صفات، یا اختیارات، یا حقوق میں اس کی شریک ہو۔ اسی طرح وہ لامحالہ قہّار بھی ہے، کیونکہ مخلوق کا اپنے خالق سے مغلوب ہو کر رہنا عین تصورِ مخلوقیت ہی میں شامل ہے۔ غلبۂ کامل اگر خالق کو حاصل نہ ہو تو وہ خلق ہی کیسے کر سکتا ہے۔ پس جو شخص اللہ کو خالق مانتا ہو اس کے لئے ان دو خالص عقلی و منطقی نتیجوں سے انکار کرنا ممکن نہیں رہتا، اور اس کے بعد یہ بات سراسر غیر معقول ٹھیرتی ہے کہ کوئی شخص خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی کرے اور غالب کو چھوڑ کر مغلوب کو مشکل کشائی کے لیے پکارے۔

ف۲ اس تمثیل میں اُس علم کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے سے نازل کیا گیا تھا، آسمانی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے، اور ایمان لانے والے سلیم الفطرت لوگوں کو اُن ندی نالوں کے مانند ٹھیرایا گیا ہے جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق بارانِ رحمت سے بھرپور ہو کر رواں دواں ہو چلتے ہیں، اور اُس ہنگامہ و شورش کو جو تحریکِ اسلامی کے خلاف منکرین و مخالفین نے برپا کر رکھی تھی اُس جھاگ اور اس خس و خاشاک سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہمیشہ سیلاب کے اٹھتے ہی سطح پر اپنی اچھل کود دکھانی شروع کر دیتا ہے۔

ف۳ یعنی بھٹی جس کام کے لئے گرم کی جاتی ہے وہ تو ہے خالص دھات کو تپا کر کارآمد بنانا، مگر یہ کام جب بھی کیا جاتا ہے میل کچیل ابھر کر ضرور آتا ہے اور اس شان سے چرخ کھاتا ہے کہ کچھ دیر تک سطح پر بس وہی وہ نظر آتا ہے۔

جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کرلی ان کے لئے بھلائی ہے، اور جنھوں نے اسے قبول نہ کیا وہ اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور بھی فراہم کرلیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائیگا[سلہ] اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، بہت ہی برا ٹھکانا۔

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے،

سلہ بری حساب فہمی یا سخت حساب فہمی سے مطلب یہ ہے کہ آدمی کی کسی خطا اور کسی لغزش کو معاف نہ کیا جائے، کوئی قصور جو اس نے کیا ہو مواخذہ کے بغیر نہ چھوڑا جائے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس طرح کا محاسبہ اپنے ان بندوں سے کرے گا جو اس کے باغی بن کر دنیا میں رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جنھوں نے اپنے خدا سے وفاداری کی ہے اور اس کے مطیع فرمان بن کر رہے ہیں ان سے "حسابِ یسیر" یعنی ہلکا حساب لیا جائے گا، ان کی خدمات کے مقابلے میں ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور ان کے مجموعی طرزِ عمل کی بھلائی کو ملحوظ رکھ کر ان کی بہت سی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کر لیا جائے گا۔ اس کی مزید توضیح اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عائشہ سے ابوداؤد میں مروی ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے نزدیک کتاب اللہ کی سب سے زیادہ خوفناک آیت وہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ۔ "جو شخص کوئی برائی کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا۔" اس پر حضور نے فرمایا عائشہ! کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ خدا کے مطیع فرمان بندے کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی کانٹا بھی اس کو چبھتا ہے تو اللہ اسے اس کے کسی نہ کسی قصور کی سزا قرار دے کر وہ قصور اس کے حساب سے ساقط کر دیتا ہے؟ آخرت میں تو جس سے بھی محاسبہ ہوگا وہ سزا پا کر رہے گا۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے کہ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا؟ "جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا"؟ حضور نے جواب دیا، اس سے مراد ہے پیشی (یعنی اس کی بھلائیوں کے ساتھ اس کی برائیاں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ضرور ہوں گی) مگر جس سے باز پرس ہوئی وہ تو بس سمجھ لو کہ مارا گیا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص اپنے وفادار اور فرمانبردار ملازم کی چھوٹی خطاؤں پر کبھی سخت گرفت نہیں کرتا بلکہ اس کے بڑے بڑے قصوروں کو بھی اس کی خدمات کے پیش نظر معاف کر دیتا ہے لیکن اگر کسی ملازم کی غداری و خیانت ثابت ہو جائے تو اس کی کوئی خدمت قابل لحاظ نہیں رہتی اور اس کے چھوٹے بڑے سب قصور شمار میں آ جاتے ہیں۔

اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟[۱] نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں[۲]۔ اور ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے[۳]۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے[۴] انھیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں[۵]، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق سے

۱؎ یعنی نہ دنیا میں ان دونوں کا رویہ یکساں ہو سکتا ہے اور نہ آخرت میں دونوں کا انجام یکساں۔

۲؎ یعنی خدا کی بھیجی ہوئی اس تعلیم اور خدا کے رسول کی اس دعوت کو جو لوگ قبول کیا کرتے ہیں وہ عقل کے اندھے نہیں بلکہ ہوش، گوش رکھنے والے بیدار مغز لوگ ہی ہوتے ہیں، اور پھر دنیا میں ان کی سیرت و کردار کا وہ رنگ اور آخرت میں ان کا وہ انجام ہوتا ہے جو بعد کی آیتوں میں بیان ہوا ہے۔

۳؎ اس سے مراد وہ ازلی عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش میں تمام انسانوں سے لیا تھا کہ وہ صرف اسی کی بندگی کریں گے (تشریح کے لئے سورۂ اعراف کو ع ۲۲ کے حواشی ملاحظہ ہوں) یہ عہد ہر انسان سے لیا گیا ہے، ہر ایک کی فطرت میں مضمر ہے، اور اسی وقت پختہ ہو جاتا ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے وجود میں آتا اور اس کی ربوبیت سے پرورش پاتا ہے۔ خدا کے رزق سے پلنا، اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے کام لینا اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو استعمال کرنا آپ سے آپ انسان کو خدا کے ساتھ ایک میثاقِ بندگی میں باندھ دیتا ہے جسے توڑنے کی جرأت کوئی ذی شعور اور نمک حلال آدمی نہیں کر سکتا الّا یہ کہ نادانستہ کبھی احیاناً اس سے کوئی لغزش ہو جائے۔

۴؎ یعنی وہ تمام معاشرتی اور تمدنی روابط جن کی درستی پر انسان کی اجتماعی زندگی کی صلاح و فلاح منحصر ہے۔

۵؎ یعنی اپنی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنے جذبات اور میلانات کو حدود کا پابند بناتے ہیں، خدا کی نافرمانی میں جو جو فائدے اور لذتوں کا لالچ نظر آتا ہے انھیں دیکھ کر پھسل نہیں جاتے، اور خدا کی فرمانبرداری میں جن جن نقصانات اور تکلیفوں کا اندیشہ ہوتا ہے انھیں برداشت کرلے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مومن کی پوری زندگی درحقیقت صبر کی زندگی ہے، کیونکہ وہ رضائے الٰہی کی امید پر اور آخرت کے پائدار نتائج کی توقع پر اس دنیا میں ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے اور گناہ کی جانب نفس کے ہر میلان کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔

علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔[۵۱] آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لئے ہے یعنی ایسے باغ جو ان کی ابدی قیامگاہ ہونگے۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤاجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لئے آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ "تم پر سلامتی ہے[۵۲]، تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس

---

[۵۱] یعنی وہ بدی کے مقابلے میں بدی نہیں بلکہ نیکی کرتے ہیں۔ وہ شر کا مقابلہ شر سے نہیں بلکہ خیر ہی سے کرتے ہیں۔ کوئی ان پر خواہ کتنا ہی ظلم کرے، وہ جواب میں ظلم نہیں بلکہ انصاف ہی کرتے ہیں۔ کوئی ان کے خلاف خواہ کتنا ہی جھوٹ بولے، وہ جواب میں سچ ہی بولتے ہیں۔ کوئی ان سے خواہ کتنی ہی خیانت کرے، وہ جواب میں دیانت ہی سے کام لیتے ہیں۔ اسی معنی میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے:

لا تکونوا امعۃ تقولون ان احسن الناس احسنا
تم اپنے طرز عمل کو لوگوں کے طرز عمل کا تابع بنا کر نہ رکھو۔
وان ظلموا ظلمنا۔ ولکن وطنوا انفسکم، ان
یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی
احسن الناس ان تحسنوا وان اساءوا فلا تظلموا۔
کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔

تم اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم نیکی کرو اور اگر لوگ تم سے بدسلوکی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔

اسی معنی میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے ۹ باتوں کا حکم دیا ہے۔ اور ان میں سے چار باتیں آپؐ نے یہ فرمائیں کہ میں خواہ کسی سے خوش ہوں یا ناراض ہر حالت میں انصاف کی بات کہوں، جو میرا حق مارے میں اس کا حق ادا کروں، جو مجھے محروم کرے میں اس کو عطا کروں، اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں۔ اور اسی معنی میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ لا تخن من خانک، "جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر۔" اور اسی معنی میں ہے حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ "جو شخص تیرے ساتھ معاملہ کرنے میں خدا سے نہیں ڈرتا اس کو سزا دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ تو اس کے ساتھ خدا سے ڈرتے ہوئے معاملہ کر۔"

[۵۲] اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ملائکہ ہر طرف سے آ آ کر ان کو سلام کریں گے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ملائکہ ان کو اس بات کی خوشخبری دیں گے کہ اب تم ایسی جگہ آگئے ہو جہاں تمہارے لئے سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اب یہاں تم ہر آفت سے، ہر تکلیف سے، ہر مشقت سے، اور ہر خطرے اور اندیشے سے محفوظ ہو۔

کے مستحق ہوئے ہو"۔ ــــــ دیکھو کیسا اچھا ہے یہ آخرت کا گھر! رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو اُن رابطوں کو کاٹتے ہیں جنھیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لئے آخرت میں بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا رزق دیتا ہے[سلہ]۔ لوگ دنیوی زندگی پر ریجھے ہیں، مگر دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ع

یہ لوگ جنھوں نے (رسالتِ محمدی کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے کہتے ہیں "اِس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری"[سلہ۲]۔ ــــــ کہو، اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف

سلہ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ عام جہلاء کی طرح کفارِ مکہ بھی عقیدہ و عمل کے حسن و قبح کو دیکھنے کے بجائے امیری اور غریبی کے لحاظ سے انسانوں کی قدر و قیمت کا حساب لگاتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ جسے دنیا میں خوب سامانِ عیش مل رہا ہے وہ خدا کا محبوب ہے، خواہ وہ کیسا ہی گمراہ و بدکار ہو، اور جو تنگ حال ہے وہ خدا کا مغضوب ہے خواہ وہ کیسا ہی نیک ہو۔ اسی بنیاد پر وہ قریش کے سرداروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غریب ساتھیوں پر فضیلت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھ لو، اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اس پر متنبہ فرمایا جا رہا ہے کہ رزق کی کمی و بیشی کا معاملہ اللہ کے ایک دوسرے ہی قانون سے تعلق رکھتا ہے جس میں بے شمار دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے کسی کو زیادہ دیا جاتا ہے اور کسی کو کم۔ یہ کوئی معیار نہیں ہے جس کے لحاظ سے انسانوں کے اخلاقی و معنوی حسن و قبح کا فیصلہ کیا جائے۔ انسانوں کے درمیان فرقِ مراتب کی اصل بنیاد اور ان کی سعادت و شقاوت کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ کس نے فکر و عمل کی صحیح راہ اختیار کی اور کس نے غلط، کس نے عمدہ اوصاف کا اکتساب کیا اور کس نے برے اوصاف کا۔ مگر نادان لوگ اس کے بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ کس کو دولت زیادہ ملی اور کس کو کم۔

سلہ۲ پہلے رکوع کے آخر میں اس سوال کا جو جواب دیا جا چکا ہے اسے پیشِ نظر رکھا جائے۔ اب دوبارہ ان کے اسی اعتراض کو نقل کر کے ایک دوسرے طریقے سے اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

آنے کا راستہ اُسے دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔[۵۱] ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنھوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور اُن کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوتِ حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لئے اچھا انجام ہے۔

اے محمدؐ! اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے،[۵۲] ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں، تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے، اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔[۵۳] ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی پر میں نے بھروسہ

---

۵۱ یعنی جو اللہ کی طرف خود رجوع نہیں کرتا اور اس سے روگردانی اختیار کرتا ہے اسے زبردستی راہِ راست دکھانے کا طریقہ اللہ کے ہاں رائج نہیں ہے۔ وہ ایسے شخص کو اُنھی راستوں میں بھٹکنے کی توفیق دے دیتا ہے جن میں وہ خود بھٹکنا چاہتا ہے۔ وہی سارے اسباب جو کسی ہدایت طلب انسان کے لیے سببِ ہدایت بنتے ہیں، ایک ضلالت طلب انسان کے لیے سببِ ضلالت بنا دیے جاتے ہیں۔ شمع روشن بھی اس کے سامنے آتی ہے تو راستہ دکھانے کے بجائے اس کی آنکھیں خیرہ ہی کرنے کا کام دیتی ہے۔ یہی مطلب ہے اللہ کے کسی شخص کو گمراہ کرنے کا۔

نشانی کے مطالبے کا یہ جواب اپنی بلاغت میں بے نظیر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی نشانی دکھاؤ تو ہمیں تمہاری صداقت کا یقین آئے۔ جواب میں کہا گیا کہ نادانو! تمہیں راہِ راست نہ ملنے کا اصل سبب نشانیوں کا فقدان نہیں ہے بلکہ تمہاری اپنی ہدایت طلبی کا فقدان ہے۔ نشانیاں تو ہر طرف بے حد و حساب پھیلی ہوئی ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی تمہارے لیے نشانِ راہ نہیں بنتی، کیونکہ تم خدا کے راستے پر جانے کے خواہشمند ہی نہیں ہو۔ اب اگر کوئی اور نشانی آئے تو وہ تمہارے لئے کیسے مفید ہو سکتی ہے۔ تم شکایت کرتے ہو کہ کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی۔ مگر جو خدا کی راہ کے طالب ہیں انھیں نشانیاں نظر آ رہی ہیں اور وہ انھیں دیکھ دیکھ کر راہِ راست پا رہے ہیں۔

۵۲ یعنی کسی ایسی نشانی کے بغیر جس کا یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں۔

۵۳ یعنی اس کی بندگی سے منہ موڑے ہوئے ہیں، اس کی صفات اور اختیارات اور حقوق میں دوسروں کو اس کا شریک بنا رہے ہیں، اور اس کی نعمتوں کے شکریے دوسروں کو ادا کر رہے ہیں۔

کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے۔

اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی یا مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟[۵۱] (اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے) بلکہ سارا اختیار ہی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔[۵۲] پھر کیا اہلِ ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟[۵۳] جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویّہ

---

[۵۱] اس آیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب کفار کی طرف سے بار بار نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو کوئی ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے۔ پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ اس پر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر قرآن کی کسی سورۃ کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں یکایک دکھا دی جاتیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمہیں ان سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبولِ حق کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کا انتظار ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبی کی پاکیزہ زندگی میں، صحابۂ کرام کے انقلابِ حیات میں نورِ حق نظر نہ آیا کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پا لیں گے؟

[۵۲] یعنی نشانیوں کے نہ دکھلانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دکھلانے پر قادر نہیں ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان طریقوں سے کام لینا اللہ کی مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اصل مقصود تو ہدایت ہے نہ کہ ایک نبی کی نبوت کو منوا لینا۔ اور ہدایت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کی فکر و بصیرت کی اصلاح ہو۔

[۵۳] یعنی اگر سمجھ بوجھ کے بغیر محض ایک غیر شعوری ایمان مطلوب ہوتا تو اس کے لیے نشانیاں دکھانے کے تکلف کی کیا حاجت تھی۔ یہ کام تو اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ سارے انسانوں کو مومن ہی پیدا کر دیتا۔

اختیار کر رکھا ہے اُن پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو، یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جاچکا ہے، مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ ع

پھر کیا وہ جو ایک ایک متنفس کی کمائی پر نظر رکھتا ہے[۵۱] (اس کے مقابلے میں یہ جسارتیں کی جارہی ہیں[۵۲] ؟) لوگوں نے اس کے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں۔ اے نبی، ان سے کہو، (اگر واقعی وہ خدا کے اپنے بنائے ہوئے شریک ہیں تو) ذرا ان کے نام لو کہ وہ کون ہیں؟ یا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا؟ یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو[۵۳]؟ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے

---

۵۱ یعنی جو ایک ایک شخص کے حال سے فرداً فرداً واقف ہے اور جس کی نگاہ سے نہ کسی نیک آدمی کی نیکی چھپی ہوئی ہے نہ کسی بد کی بدی۔

۵۲ جسارتیں یہ کہ اس کے ہمسر اور مدِ مقابل تجویز کیے جارہے ہیں، اس کی ذات اور صفات اور حقوق میں اس کی مخلوق کو شریک کیا جارہا ہے، اور اس کی خدائی میں رہ کر لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو کچھ چاہیں کریں ہم سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔

۵۳ یعنی اس کے شریک جو تم نے تجویز کر رکھے ہیں اُن کے معاملے میں تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے پاس کوئی مستند اطلاع آئی ہو کہ اللہ نے فلاں فلاں ہستیوں کو اپنی صفات، یا اختیارات یا حقوق میں شریک قرار دیا ہے۔ اگر یہ صورت ہے تو ذرا براہِ کرم ہمیں بھی بتاؤ کہ وہ کون کون اصحاب ہیں اور ان کے شریکِ خدا مقرر کیے جانے کی اطلاع آپ کو کس ذریعہ سے پہنچی ہے۔ دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ اللہ کو خود خبر نہیں ہے کہ زمین میں کچھ حضرات اس کے شریک بن گئے ہیں اور اب آپ اس کو یہ اطلاع دینے چلے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو صفائی کے ساتھ اپنی اس پوزیشن کا اقرار کرو۔ پھر ہم بھی دیکھ لیں گے کہ دنیا میں کتنے ایسے احمق نکلتے ہیں جو تمہارے اس سراسر لغو مسلک کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم بغیر کسی سند اور بغیر کسی دلیل کے یونہی جس کو چاہتے ہو خدا کا رشتہ دار ٹھیرا لیتے ہو، جس کو چاہتے ہو داتا اور فریاد رس کہہ دیتے ہو اور جس کے متعلق چاہتے ہو دعویٰ کر دیتے ہو کہ فلاں علاقے کے سلطان فلاں صاحب ہیں اور فلاں کام فلاں حضرت کی تائید و امداد سے بر آتے ہیں۔

انکار کیا ہے ان کے لیے اُن کی مکاریاں[۵۱] خوشنما بنا دی گئی ہیں اور وہ راہِ راست سے روک دیئے گئے ہیں،[۵۲] پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے، کوئی ایسا نہیں جو انھیں خدا سے بچانے والا ہو۔ خدا ترس انسانوں کے لئے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال۔ یہ انجام ہے متقی لوگوں کا۔ اور منکرینِ حق کا انجام یہ ہے کہ ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے۔

۵۱ اس شرک کو مکاری کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ دراصل جن اجرامِ فلکی یا فرشتوں یا ارواح یا بزرگ انسانوں کو خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دیا گیا ہے، اور جن کو خدا کے مخصوص حقوق میں شریک بنا لیا گیا ہے، اُن میں سے کسی نے بھی کبھی ان صفات و اختیارات کا دعویٰ کیا، نہ ان حقوق کا مطالبہ کیا، اور نہ لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ تم ہمارے آگے پرستش کے مراسم ادا کرو، ہم تمہارے کام بنایا کریں گے۔ یہ تو چالاک انسانوں کا کام ہے کہ انھوں نے عوام پر اپنی خدائی کا سکہ جمانے کے لئے اور ان کی کمائیوں میں حصہ بٹانے کے لئے کچھ بناوٹی خدا تصنیف کیے، لوگوں کو اُن کا معتقد بنایا اور اپنے آپ کو کسی نہ کسی طور پر ان کا نمائندہ ٹھیرا کر اپنا الو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔ دوسری وجہ شرک کو مکر سے تعبیر کرنے کی یہ ہے کہ دراصل یہ ایک فریبِ نفس ہے اور ایک چور دروازہ ہے جس کے ذریعے سے انسان دنیا پرستی کے لیے اخلاقی بندشوں سے بچنے کے لیے اور غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کے لیے راہِ فرار نکالتا ہے۔ تیسری وجہ جس کی بنا پر مشرکین کے طرزِ عمل کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے آگے آتی ہے۔

۵۲ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان ایک چیز کے مقابلے میں دوسری چیز کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لئے مصدر لوگوں کو اپنی راست روی کا یقین دلانے کے لئے اپنی اختیار کردہ چیز کو ہر طریقے سے استدلال کر کے حق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی رد کردہ چیز کے خلاف ہر طرح کی باتیں چھانٹنی شروع کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ جب انھوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا تو قانونِ فطرت کے مطابق ان کے لئے ان کی گمراہی اور وہ ... گمراہی پر قائم رہنے کے لئے ان کی مکاری خوشنما بنا دی گئی اور اسی فطری قانون کے مطابق یہ راہِ راست پر آنے سے روک دیئے گئے۔

اے نبی! جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے۔ تم صاف کہہ دو کہ "مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیراؤں۔ لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے[۵۱]۔" اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمانِ عربی تم پر نازل کیا ہے۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔

تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا[۵۲]۔ اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا[۵۳]۔ ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے۔ اللہ جو

---

۵۱ یہ ایک خاص بات کا جواب ہے جو اُس وقت مخالفین کی طرف سے کہی جا رہی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ صاحب واقعی وہی تعلیم لے کر آئے ہیں جو پچھلے انبیاء لائے تھے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، تو آخر کیا بات ہے کہ یہود و نصاریٰ، جو پچھلے انبیاء کے پیرو ہیں، آگے بڑھ کر ان کا استقبال نہیں کرتے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ اس پر خوش ہیں اور بعض ناراض، مگر اے نبی، خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض، تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو خدا کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی ہے اور میں بہر حال اسی کی پیروی کروں گا۔

۵۲ یہ ایک اور اعتراض کا جواب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی اور بچے رکھتا ہے، بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

۵۳ یہ بھی ایک اعتراض کا جواب ہے۔ مخالفین کہتے تھے کہ موسٰیؑ ید بیضا اور عصا لائے تھے۔ مسیحؑ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے تھے۔ صالحؑ نے اونٹنی کا نشان دکھایا تھا۔ تم کیا نشانی لے کر آئے ہو؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جس نبی نے جو چیز بھی دکھائی ہے اپنے اختیار اور اپنی طاقت سے نہیں دکھائی ہے۔ اللہ نے جس وقت جس کے ذریعے سے جو کچھ ظاہر کرنا مناسب سمجھا وہ ظہور میں آیا۔ اب اگر اللہ کی مصلحت ہو گی تو جو کچھ وہ چاہے گا دکھائے گا۔ پیغمبر خود کسی خدائی اختیار کا مدعی نہیں ہے کہ تم اس سے نشانی دکھانے کا مطالبہ کرتے ہو۔

کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے، اُمّ الکتاب اسی کے پاس ہے۔[۵۱]

اور اے نبی! جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصّہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں، بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔[۵۲] کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے جاتے ہیں؟[۵۳] اللہ حکومت کر رہا ہے، کوئی اس کے فیصلوں پر نظرثانی کرنے والا نہیں ہے، اور

۵۱۔ یہ بھی مخالفین کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ وہ کہتے تھے کہ پہلے آئی ہوئی کتابیں جب موجود تھیں تو اس نئی کتاب کی کیا ضرورت تھی؟ تم کہتے ہو کہ ان میں تحریف ہو گئی ہے، اب وہ منسوخ ہیں اور اس نئی کتاب کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر خدا کی کتاب میں تحریف کیسے ہو سکتی ہے؟ خدا نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ اور کوئی خدائی کتاب منسوخ کیسے ہو سکتی ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ اسی خدا کی کتاب ہے جس نے توراۃ وانجیل نازل کی تھیں۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ تمہارا طریقہ توراۃ کے بعض احکام کے خلاف ہے؟ مثلاً بعض چیزیں جنھیں توراۃ والے حرام کہتے ہیں تم انھیں حلال سمجھ کر کھاتے ہو۔ ان اعتراضات کے جوابات بعد کی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ یہاں ان کا صرف ایک مختصر جامع جواب دے کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

"اُم الکتاب" کے معنی ہیں "اصل کتاب" یعنی وہ منبع و سرچشمہ جس سے تمام کتب آسمانی نکلی ہیں۔

۵۲۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ جن لوگوں نے تمہاری اس دعوتِ حق کو جھٹلا دیا ہے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور کب وہ ظہور میں آتا ہے۔ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے اسے پوری یکسوئی کے ساتھ کیے چلے جاؤ اور فیصلہ ہم پر چھوڑ دو۔ یہاں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل بات ان مخالفین کو سنانی مقصود ہے جو چیلنج کے انداز میں بار بار حضور سے کہتے تھے کہ ہماری جس شامت کی دھمکیاں تم ہمیں دیا کرتے ہو آخر وہ آ کیوں نہیں جاتی۔

۵۳۔ یعنی کیا تمہارے مخالفین کو نظر نہیں آرہا ہے کہ اسلام کا اثر سرزمینِ عرب کے گوشے گوشے میں پھیلتا جا رہا ہے اور چاروں طرف سے ان پر حلقہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ان کی شامت کے آثار نہیں ہیں تو کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں" ایک نہایت لطیف انداز بیان ہے۔ چونکہ دعوتِ حق اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ اس کے پیش کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے کسی سرزمین میں اس دعوت کے پھیلنے کو اللہ اس طرح تعبیر فرماتا ہے کہ ہم خود اس سرزمین میں بڑھے چلے آرہے ہیں۔

اسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اِن سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں،[۱] مگر اصل فیصلہ کُن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے، اور عنقریب یہ منکرینِ حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے۔

یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر ہر اُس شخص کی گواہی جو کتابِ آسمانی کا علم رکھتا ہے۔"[۲] ع ۶

---

[۱] یعنی آج کوئی نئی بات نہیں ہے کہ حق کی آواز کو دبانے کے لئے جھوٹ اور فریب اور ظلم کے ہتھیار استعمال کئے جا رہے ہوں۔ پچھلی تاریخ میں بارہا ایسی ہی چالوں سے دعوتِ حق کو شکست دینے کی کوششیں کی جا چکی ہیں۔

[۲] یعنی ہر وہ شخص جو واقعی آسمانی کتابوں کے علم سے بہرہ ور ہے اس بات کی شہادت دے گا کہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء لے کر آئے تھے۔

منشور جماعت اسلامی برائے انتخابات پنجاب

حصۂ اول

توضیحات

جماعت اسلامی پاکستان جس مقصد کے لئے پنجاب کے انتخابات میں حصہ لے رہی ہے اور جس پروگرام کو وہ اس صوبے میں نافذ کرنا چاہتی ہے اس کی تشریح سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند امور کو واضح طور پر بیان کر دیا جائے تاکہ سب لوگ ہمارے موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

(۱)

یہ جماعت اگرچہ دوسری جماعتوں کی طرح کوئی سیاسی یا مذہبی یا معاشی جماعت نہیں ہے جن پر عام طور پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں، بلکہ یہ درحقیقت ایک اسلامی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور عالمگیر نظریۂ حیات پر یقین رکھتی ہے اور اُس نظریہ کو انسانی عقائد و افکار میں، اخلاق و عادات میں، علوم و فنون میں، ادب اور آرٹ میں، تمدن و تہذیب میں، مذہب اور معاشرت میں، معاشی معاملات میں، سیاست اور نظم مملکت میں، اور بین الاقوامی تعلقات و روابط میں عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک دنیا کے بگاڑ کا حقیقی سبب خدا کی اطاعت سے انحراف، آخرت کی جواب دہی سے بے نیازی اور انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی سے روگردانی ہے اور دنیا میں جب کبھی، جہاں کہیں، جس شعبۂ زندگی میں بھی بگاڑ رونما ہوا ہے یہی اس کا بنیادی سبب رہا ہے، کیونکہ یہ طرز فکر و عمل حق کے خلاف ہے۔ اس جماعت کے عقیدے میں "الحق" یہ ہے کہ خدا اس پوری کائنات کا مالک و حاکم ہے، انسان اس کے سامنے جواب دہ ہے، اور صرف انبیاء کی تعلیم ہی ہدایت کا اصل سرچشمہ ہے۔ لہٰذا یہ جماعت نوعِ انسانی کے لئے فلاح کی صرف ایک ہی صورت دیکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور گوشوں سمیت خدائے واحد کی بندگی و اطاعت کے

اصول پر قائم ہو، اس بندگی و اطاعت کے لیے انبیاء علیہم السلام کی اُس رہنمائی کو سند مانا جائے جو آج اپنی صحیح و کامل صورت میں صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی میں موجود ہے اور افراد کی سیرتوں سے لے کر قوموں کے اجتماعی طرز عمل تک ہر چیز کو اُس اخلاقی رویہ پر قائم کیا جائے جس کی بنیاد آخرت کی جواب دہی کے احساس پر رکھی گئی ہو۔

(۲)

یہ جماعت قوم پرست اور وطن پرست جماعتوں کی طرح اپنے مطمح نظر کو اپنے ہی ملک کے حدود تک محدود نہیں رکھتی بلکہ پوری انسانیت کی فلاح اِس کے پیشِ نظر ہے۔ پاکستان میں اس کی کوششیں محض برائے پاکستان نہیں ہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے ملک کے نظامِ زندگی کو مذکورۂ بالا نظریہ کے مطابق درست کریں، پھر اُس کو تمام دنیا کے لیے نمونۂ ہدایت اور ذریعۂ اصلاح بنائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا مقصدِ زندگی ساری دنیا میں حق کا بول بالا کرنا ہے۔ مگر دنیا میں ہم یہ خدمت اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک سب سے پہلے خود اپنے گھر میں حق کا بول بالا نہ کر دیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے ہم دنیا پر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم خود عملاً اس حق کی پیروی کر رہے ہیں جس کی طرف دوسروں کو دعوت دینا چاہتے ہیں، اور صرف اسی صورت سے دنیا کے سامنے اس امر کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے کہ حق پرستی اس چیز کا نام ہے اور یہ اس کے نتائج اور فوائد ہیں۔

(۳)

اس جماعت کے نزدیک پاکستان میں دراصل کسر اس چیز کی نہیں ہے کہ یہاں خدا اور آخرت اور رسالت کے ماننے والوں کی کمی ہے، بلکہ اس چیز کی ہے کہ جس حق کو یہاں کی اکثریت مانتی ہے وہ عملاً نافذ ہو اور اسی پر ہمارے ملک کا پورا نظامِ زندگی قائم ہو۔ یہ کوئی معمولی کسر نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑی کسر ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے ہمارا یہ ملک ایک اسلامی ملک ہونے کے باوجود نہ اسلام کی نعمتوں اور برکتوں سے خود فائدہ اٹھا رہا ہے نہ دنیا کے لیے اسلام کی حقانیت کا گواہ بن رہا ہے۔ اور یہ کسر اس لحاظ سے کوئی ہلکی کسر بھی نہیں ہے کہ اسے پورا کر دینا آسان ہو۔ اس کی پشت پر بہت سے طاقتور اسباب ہیں جنھیں بڑی سخت جدوجہد کے

بعد دور کیا جا سکتا ہے۔

ایک طرف ہمارے عوام کی اسلام سے ناواقفیت ہے جس کی وجہ سے وہ اس دین کے عقیدت مند ہونے کے باوجود اس کی صحیح پیروی سے قاصر ہو رہے ہیں۔

دوسری طرف ہمارے اندر بہت سے ایسے مانع اصلاح طبقوں کی موجودگی ہے جو اپنے تعصبات کی وجہ سے یا اپنی اغراض کی خاطر مختلف پرانی یا نئی جاہلیتوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور خالص اسلام کے قیام کی راہ روک رہے ہیں۔

تیسری طرف ہمارا ماضی قریب ہے جو ہمیں اس حال میں چھوڑ گیا ہے کہ انگریزی اقتدار نے اپنی تعلیم سے، اپنے تہذیبی و تمدنی اثرات سے، اپنے قوانین سے، اور اپنی انتظامی پالیسی سے ہماری زندگی کے ہر شعبے کو غیر اسلامی سانچوں میں ڈھال دیا، حتیٰ کہ ہمارے مذہبی عقائد اور ہمارے اخلاق تک کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔

ان سب پر مزید یہ کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہماری قومی زندگی کی باگیں آئی ہیں اور جن کو اس نوخیز ریاست کی تعمیر و تشکیل کے اختیارات ملے ہیں وہ اگرچہ اسلام ہی کا نام لے کر برسرِ اقتدار آئے ہیں اور دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی نظامِ زندگی کو از سرِ نو قائم کریں گے، لیکن نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ ان کی اپنی زندگیاں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ اسلام کے طریقے پر خود عامل ہیں، اور نہ ان کا اب تک کا طرزِ عمل یہ امید دلاتا ہے کہ ان کے ہاتھوں یہ ملک کبھی فرنگیت کے راستے سے ہٹ کر اسلام کے راستے پر چل سکے گا۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے بنیادی اسباب جن کی وجہ سے پاکستان میں اِس کسر کو پورا کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ یہاں کی اکثریت جس چیز کو حق جانتی اور مانتی ہے وہ یہاں عملاً نافذ ہو اور اسی پر یہاں کا پورا نظامِ زندگی قائم ہو۔

(۴)

جماعت اسلامی ان تمام اسباب کو دور کرنے کے لئے ایک مدت سے کوشاں ہے۔ وہ تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے عوام میں اسلام کا علم پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ اُن تمام نئی اور پرانی جاہلیتوں کے خلاف بھی نبرد آزما ہے جنھوں نے ہماری قومی زندگی کے مختلف گوشوں میں ڈیرے جما رکھے ہیں۔ وہ انگریزی اقتدار کے ان تمام

اثرات پر بھی تنقید کر رہی ہے جنھوں نے اخلاق اور نظریات سے لے کر معاشرت اور معیشت اور سیاست تک ہماری ہر چیز کو اسلامی نقطۂ نظر سے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ علمی حیثیت سے یہ بھی بتا رہی ہے کہ اسلامی اصولوں پر ہر شعبۂ حیات کی تعمیرِ جدید کس طرح کی جا سکتی ہے اور اس وقت کے مسائلِ زندگی کا حل کیا ہے۔ وہ عملی حیثیت سے اس بات کی کوشش بھی کر رہی ہے کہ لوگوں کے اندر خدا کی بندگی اور انبیاء کی پیروی کا جذبہ اور ایمانی اخلاق کا رنگ پیدا ہو اور ایسی سیرتیں تیار ہوں جن میں آخرت کی جواب دہی کا احساس کارفرما ہو لیکن ان سب باتوں کے ساتھ وہ یہ بھی ضروری سمجھتی ہے کہ پاکستان کا دستورِ حکومت خالص اسلامی بنیادوں پر بنایا جائے اور اس حکومت کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے جو اسلام کے مطابق کام کرنا جانتے بھی ہوں اور چاہتے بھی ہوں۔ یہ چیز اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہماری قومی حکومت کے ذرائع و وسائل اور حاکمانہ اختیارات اسلامی زندگی کی تعمیر میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ اور یہ چیز اس بنا پر بڑی اہمیت بھی رکھتی ہے کہ اگر ایک طرف یہاں اسلامی اصلاح و انقلاب کے خواہشمند لوگ غیر سیاسی تدبیروں سے اسلامی زندگی کی تعمیر کرنے کے لیے کوششیں کریں، اور دوسری طرف ہماری قومی حکومت کا انتظام ایسے فرنگیت مآب لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو اپنی پوری سیاسی طاقت اس ملک کو انگلستان، امریکہ یا روس کی نقل مطابق اصل بنانے کی کوشش میں صرف کر دیں، تو اس سے یہاں ایک سخت کشمکش رونما ہو گی جو کسی حیثیت سے بھی اس ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس طرح ہر ایک جو کچھ بنانے کی کوشش کرے گا دوسرا اسے بگاڑنے میں اپنی طاقت صرف کرتا رہے گا اور فی الواقع یہاں کچھ بھی نہ بن سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جماعت اپنی دوسری کوششوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاسی قیادت کو ایک صالح قیادت سے بدلنے کی جدوجہد بھی کر رہی ہے۔

(۵)

جماعت اسلامی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے کہ پنجاب یا کسی دوسرے صوبے کے انتخابات میں صالح لوگوں کے منتخب ہو جانے سے کسی جگہ بھی اسلامی زندگی کی تعمیر اور موجودہ خرابیوں کی اصلاح کا کوئی بڑا کام ہو سکے گا۔ وہ اس بات کو خوب جانتی ہے کہ حقیقی تعمیر و اصلاح کا کوئی کام بھی مرکزی قیادت کی تبدیلی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ دستور کی رو سے حکومت کے سارے اختیارات مرکز کے ہاتھ میں ہیں اور صوبوں کو جو اختیارات

...................بظاہر حاصل ہیں وہ بھی دراصل کسی صوبے کی اسمبلی یا وزارت کے قبضے میں نہیں ہیں بلکہ اُس گورنر کے قبضے میں ہیں جو مرکز کے ایجنٹ کی حیثیت سے صوبے پر مسلط ہے اس لئے مرکز اور اس کے مقرر کیے ہوئے گورنر کے ساتھ ساز باز رکھنے والی پارٹی تو ایک صوبے میں سب کچھ کر سکتی ہے مگر جو پارٹی مرکز کی منظورِ نظر نہ ہو اس کے راستے میں مرکز اور گورنر مل کر اتنی رکاوٹیں ڈال سکتے ہیں کہ وہ مشکل ہی کوئی کام کر سکتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود یہ جماعت جن مقاصد کے لیے پنجاب کے تازہ انتخابات میں حصہ لے رہی ہے اور آئندہ ہر ایسے انتخاب میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے جو ملک میں کسی جگہ منعقد ہو وہ یہ ہیں :-

(۱) انتخابات میں ملک کے عام رائے دہندوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا جو موقع ملتا ہے اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ عوام کو اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی لینے، بھلے اور برے کو سمجھنے اور خود رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کو یہ بتایا جائے کہ جس اسلامی نظام کے لئے انہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا وہ دراصل کیا ہے، اس کو قائم کرنے اور چلانے کے لئے کس اخلاق اور کس قابلیت کے لوگ درکار ہیں، اس کے قائم ہونے کے فائدے اور قائم نہ ہونے کے نقصانات کیا ہیں، ووٹ کا اختیار حاصل ہونے سے ان پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس ذمہ داری کو وہ کس طرح صحیح طریقہ سے ادا کر سکتے ہیں۔

(۲) عام رائے دہندوں کی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو اس حد تک منظم بھی کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی پنچائتیں بنا کر اپنی نمائندگی کے لیے ایسے آدمیوں کو چنیں جن کی دینی و اخلاقی حالت اور قابلیت پر ان کو اعتماد ہو۔ اس تنظیم کو ہم عارضی وہنگامی حیثیت دینے کے بجائے مستقل حیثیت دینا چاہتے ہیں تاکہ ہمیشہ کے لئے امیدواری کا غیر اسلامی طریقہ متروک ہو کر وہ طریقۂ انتخاب رائج ہو جائے جو اسلام کی روح سے قریب تر ہے، اور رفتہ رفتہ اُس پارٹی سسٹم کا بھی خاتمہ کیا جا سکے جو اسلامی نظام سے مناسبت نہیں رکھتا اور عوام کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ صرف ایک انتخاب کا معاملہ ہی نہیں، اپنی اجتماعی زندگی کے دوسرے مسائل و معاملات کو بھی باہم مل جل کر طے کر لیا کریں۔

(۳) انتخابی جد و جہد کے ان غلط طریقوں کو، جن میں جھوٹ، فریب، جوڑ توڑ، غنڈہ گردی، گالم گلوچ، زرپاشی اور ضمیروں کی خرید و فروخت کے سارے ہی ناپاک ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں، بند کیا جائے اور ان کی جگہ ایسے معقول اور مہذب طریقے رائج کیے جائیں جن سے قوم کے شریف عناصر کے لئے انتخابات میں حصہ لینا ممکن ہو اور عوام آزادی کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنی رائے استعمال کر سکیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت ہماری قومی زندگی پر کس قسم کے پست اخلاق لوگ چھائے ہوئے ہیں اور وہ اصلاح کی کوشش کرنیوالوں پر کیسی کچھ غلاظت اچھال سکتے ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ اگر شریف لوگ منظم ہو کر اور ایک دفعہ جی کڑا کرکے اس گندگی کو صاف نہ کر دیں گے تو یہاں کی فضا کبھی ستھری نہ ہو سکے گی۔

(۴) پنچائتی نظام کے ذریعے سے جو صالح آدمی منتخب ہو کر کسی صوبے کی اسمبلی میں جائیں وہ ایک اسلامی پارٹی کی صورت میں منظم ہوں اور اصلاح کے اس پروگرام کو سامنے لائیں جسے اس منشور میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ پارٹی اپنے صوبے کی اسمبلی میں قلیل التعداد ہو تو اس پروگرام کے پیش کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام ملک کے سامنے وہ حق بھی آجائے گا جسے ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اور وہ باطل بھی آجائے گا جس پر برسر اقتدار طبقہ ملک کا نظام چلا رہا ہے۔ دونوں کا فرق جتنا جتنا واضح ہوتا جائے گا رائے عام حق کی تائید میں ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ اور اگر اس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو تو یہ مرکز اور اس کے گورنر کی ہر مزاحمت کے باوجود اپنے پروگرام کو نافذ کرنے کی کوشش کرے گی اور جب اسے کام نہ کرنے دیا جائے گا تو وہ مستعفی ہو کر تمام ملک کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کر دے گی کہ یہاں دراصل کون ساری خرابیوں کا پشت پناہ ہے اور کس کی وجہ سے اصلاح و تعمیر کا راستہ بند ہے۔ یہ چیز ان شاء اللہ مرکز کی قیادت کی تبدیلی میں مددگار ثابت ہو گی۔

(۶)

جماعت اسلامی اپنا یہ منشور اُن حدود کو ملحوظ رکھ کر مرتب کر رہی ہے جن میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ایک صوبے کی حکومت کے اختیارات محدود کیے گئے ہیں۔ اس لئے اس میں ان مسائل و معاملات سے بحث نہیں کی گئی ہے جو براہ راست مرکزی حکومت کے اختیارات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس منشور میں وہ اصلاحی لائحہ عمل نہیں دیا گیا ہے جسے ہم پورے پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں، بلکہ یہ صرف پنجاب کی صوبائی حکومت میں نافذ کرنے کے لئے

(۷)

جماعت اسلامی اس منشور کو اس حیثیت سے پیش نہیں کر رہی ہے کہ وہ خود اسے نافذ کرنے کی ذمہ داری لیتی ہے۔ جماعت نے انتخابات میں جو طریقِ کار اختیار کیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ٹکٹ پر اپنے ارکان کو اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا کر رہی ہو اور اسمبلی میں خود اپنی ایک پارلیمنٹری پارٹی بنانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اس کے بجائے اس نے مختلف حلقہائے انتخاب کے رائے دہندوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی پنچائتیں ...... بنا کر خود جن لوگوں کو صالح سمجھیں انھیں اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کریں۔ جہاں جہاں یہ پنچائتیں بنی ہیں، وہ اپنے فیصلے میں بالکل آزاد ہیں اور وہ ہمارے جماعتی نظم کا کوئی جز نہیں ہیں۔ ہم یہ منشور انھی پنچایتوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں، تاکہ اگر وہ اسے اپنے منشور کی حیثیت سے قبول کر لیں تو اپنے چنے ہوئے نمائندوں کو اس پر عمل کرنے کا پابند بنائیں۔ اگر پنچایتوں کے چنے ہوئے نمائندوں میں جماعت اسلامی کے ارکان اور ہمدردوں کی اکثریت ہو تو جماعت خود اس پروگرام پر عمل درآمد کرانے کا ذمہ لے گی لیکن اگر ان میں اکثریت ایسے اصحاب کی ہو جو ہمارے جماعتی نظم کے پابند نہیں ہیں تو ان سے اپنے پروگرام پر عمل کرانا پنچایتوں کا اپنا کام ہوگا۔ اسی لیے یہ منشور عام جماعتوں کے منشوروں سے مختلف طرز پر مرتب کیا جا رہا ہے۔ اس میں ہم صرف یہ بتا رہے ہیں کہ صوبائی اسمبلی میں ایک اسلامی پارٹی کو کس طرح کام کرنا چاہیے اور کیا کام کرنا چاہیے۔

حصۂ دوم

لائحۂ عمل

اس لائحۂ عمل میں وہ طریقِ کار بیان کیا جا رہا ہے جس پر پنچایتی نظام کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کو صوبائی اسمبلی کے اندر اور باہر کاربند ہونا چاہیے۔

نمائندوں کا عہد نامہ ہر اس شخص کو جسے کسی حلقے کے پنچایتی نظام نے اپنا نمائندہ نامزد کیا ہو نہ صرف اپنی

نامزد کرنے والی پنچایت کے سامنے بلکہ ایک مجمع عام میں لوگوں کے سامنے بھی یہ عہد کرنا چاہیئے کہ:۔

(۱) وہ خدا اور رسول کی وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھے گا اور پوری خدا ترسی و ایمانداری کے ساتھ کوشش کرے گا کہ ملک کا انتظام شریعتِ خداوندی کے احکام اور اس کی روح کے مطابق چلایا جائے۔

(۲) وہ اسمبلی کے اندر یا اس کے باہر اپنی پوزیشن سے اپنی ذاتی اغراض یا اپنے خاندان اور احباب کی اغراض، یا کسی خاص طبقے اور گروہ کی اغراض کے لیے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے گا۔

(۳) وہ اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام سے قریب تر رہے گا، عام لوگوں کی شکایات و مشکلات اور ضروریات و احساسات سے باخبر رہنے کی کوشش کرے گا، اور اسمبلی کے اندر اور باہر اپنی حد تک پوری کوشش کرے گا کہ آئینِ انصاف کے مطابق بے لاگ طریقے سے عوام کی خدمت کرے۔

(۴) اگر کسی وقت اس کے حلقۂ انتخاب کے عام لوگ اسی پنچایتی نظام کے ذریعے سے اس پر اظہارِ بے اعتمادی کریں جس کے ذریعے سے آج وہ اس پر اظہارِ اعتماد کر رہے ہیں تو وہ اپنی نشست سے استعفا دیدیگا۔

(۵) وہ اسمبلی کے اندر دھڑے بندیوں، سازشوں اور وزارت کے جوڑ توڑ سے الگ رہے گا اور صاف صاف ایماندارانہ طریقے سے اس منشور کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گا جو اسے پنچایتوں کی رضامندی سے دیا جا رہا ہے۔

(۶) وہ اسمبلی کے اندر ایک آزاد رکن کی حیثیت سے تنہا نہ رہے گا بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ ایک پارٹی میں شامل ہو جائے گا جو اس منشور کو عملی جامہ پہنانے کا عہد کریں۔

نمائندوں کے انفرادی فرائض

ہر ایسے نمائندے کا، جو عوامی پنچایتوں کی طرف سے نامزد ہو اور عوام کے ووٹوں سے اسمبلی کی رکنیت کے لیے منتخب ہو جائے، یہ فرض ہونا چاہیئے کہ:

(۱) وہ پوری پابندی کے ساتھ اسمبلی کے اجلاسوں میں شریک ہو اور اس کی کارروائیوں میں دلچسپی لے۔ شدید مجبوری کے بغیر اسمبلی کے اجلاسوں سے غیر حاضر رہنا اس کے لئے جائز نہیں ہے۔

(۲) وہ اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کرے، جس چیز کو حق اور انصاف

سمجھتا ہے اسے حق اور انصاف کہے اور اس کی تائید میں آواز اٹھائے، اور جس چیز کو غلط اور خلاف انصاف سمجھتا ہے اس کی مخالفت کرے۔ حق کو حق جانتے ہوئے اس کی تائید نہ کرنا، اور غلط کو غلط جانتے ہوئے اس کے مقابلے میں خاموش رہنا اُن لوگوں کے ساتھ خیانت ہے جنھوں نے ایک شخص کی دیانت پر بھروسہ کرکے اسے اپنا نمائندہ نامزد کیا ہے۔

(۳) وہ نظم و نسق کے مختلف شعبوں سے واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش کرے تاکہ وہ اسمبلی میں پیش آنیوالے معاملات پر زیادہ سے زیادہ علم و بصیرت کے ساتھ رائے دینے کے قابل ہو۔

(۴) وہ اپنے آپ کو صرف انھی لوگوں کا نمائندہ نہ سمجھے جنھوں نے اس کو رائے دی ہو بلکہ اپنے پورے حلقۂ انتخاب کی عام آبادی کا نمائندہ سمجھے اور ان کی فلاح کے لئے کام کرے۔ اسے اپنے حلقۂ انتخاب کی مقامی دھڑے بندیوں سے الگ رہنا چاہیے اور ایک غیر جانبدار خادم خلق ہونے کی حیثیت سے عام لوگوں کی بہتری مدنظر رکھنی چاہیئے۔

(۵) وہ اپنے فرائض کو صرف اسمبلی کے کام تک محدود نہ رکھے بلکہ اسمبلی کے باہر بھی اپنے حلقۂ انتخاب کے باشندوں کی دینی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی حالت درست کرنے کی کوشش کرے۔ وہ عوام کا صحیح نمائندہ نہیں ہے اگر عوام کے دکھ درد میں ان کا شریک نہ ہو، اجتماعی مصائب کے موقع پر ان کی خدمت کے لئے حاضر نہ رہے، اور اجتماعی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی نہ لے۔

اسلامی پارٹی کی تشکیل پنچائتی نظام کے تحت منتخب ہونے والے نمائندوں کو اسمبلی میں جا کر ایک اسلامی پارٹی کی صورت میں منظم ہونا چاہیئے جس کا عقیدہ، مقصد، اصول اور پالیسی حسب تفصیل ذیل ہو۔

عقیدہ اس پارٹی کا عقیدہ یہ ہونا چاہیئے:

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے قانون کا ماخذ اور ہدایت کا سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے۔ ہم زندگی کے ہر معاملہ میں بنیادی تصورات اور اصول قرآن و سنت کی تعلیمات سے اخذ کریں گے اور عملی تفصیلات اگر دوسرے مآخذ سے

لیں گے بھی تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں۔ ہمارے نزدیک ملک میں کسی قانون کو جاری کرنے یا جاری رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یا تو اس قانون کے جواز کا ثبوت قرآن و سنت سے ملتا ہو، یا کم از کم اس کے ناجائز ہونے کا ثبوت نہ ملتا ہو ہم حکومت کے لیئے حدود اللہ کی پابندی کو ضروری سمجھتے ہیں، اور ہمارے نزدیک یہ بات حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق معاشرے کی اخلاقی، مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور معاشی حالت کو درست کرے۔"

مقصد | اس پارٹی کا مقصد، جس کے لئے وہ اسمبلی میں کام کرے گی، یہ ہونا چاہیئے:

"صوبے کے قوانین اور نظم و نسق کو، جہاں تک بھی موجودہ دستور کے اندر اس کی گنجائش ہے، اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ حکومت کی انتظامی مشینری کے اندر جو اخلاقی خرابیاں پائی جاتی ہیں ان کو دور کیا جائے۔ حکومت کے ذرائع و وسائل کو اسلامی اصولوں کے مطابق صوبہ کی اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی حالت کی اصلاح کے لیے استعمال کیا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو ایسی تدابیر عمل میں لائی جائیں جن سے اس صوبہ ہی میں نہیں، پورے پاکستان میں اسلامی نظام زندگی کے قیام و ارتقار کے لئے زمین ہموار ہو سکے۔"

اصول | اس پارٹی کی تشکیل اِن اصولوں پر ہونی چاہیئے:۔

(۱) صوبائی اسمبلی کا ہر وہ رکن اس پارٹی میں شامل ہو سکے جو مذکورۂ بالا عقیدے اور مقصد کو قبول کر کے اُس لائحۂ عمل پر کام کرنے کا اقرار کرے جو اس منشور میں دیا گیا ہے، خواہ وہ پنچائتی نظام کے سوا کسی اور طریقے سے منتخب ہو کر آیا ہو۔

(۲) اُس کا پارٹی ڈسپلن اس قاعدے پر مبنی ہو کہ خدا اور رسول کے احکام کی پابندی اور راستی و انصاف میں تعاون کیا جائے مگر کوئی شخص حق اور انصاف کے خلاف کاموں میں اپنی پارٹی کی حمایت کا پابند نہ ہو۔ بلکہ پارٹی کے ہر رکن کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی پارٹی کو حق اور انصاف کے خلاف کوئی کام نہ کرنے دے۔

(۳) پارٹی کا داخلی نظم مغربی جمہوریت کے بجائے اسلامی جمہوریت پر مبنی ہوگا۔[۱]

پالیسی

اسمبلی کے اندر اس پارٹی کی پالیسی یہ ہونی چاہیے:۔

(۱) وہ احکام اسلامی کے اجرا اور انصاف کے قیام میں اسمبلی کی تمام دوسری پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرے مگر ناجائز امور میں یا ناروا اغراض کی تکمیل میں کسی کی مددگار نہ بنے۔

(۲) اگر وہ اکثریت میں ہو تو وہ اپنی وزارت بنائے گی اور اس صورت میں اس کی پالیسی یہ ہوگی:

(الف) مخالف پارٹیوں کے مقابلے میں اس ضد اور ہٹ دھرمی اور جماعتی تعصب سے کام نہ لیا جائے جو بالعموم اکثریت رکھنے والی جماعتوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ کھلے دل سے مخالف و موافق سب کی بات سنی جائے، ہر صحیح بات کو قبول کیا جائے اور معقول دلائل کے مقابلے میں کبھی اپنی تجویزوں اور تدبیروں پر بیجا اصرار نہ کیا جائے۔

(ب) حاکمانہ زعم میں پبلک کی تنقیدوں سے بے پروائی نہ برتی جائے۔

(ج) پبلک کی شکایات کی طرف، خواہ وہ اخبارات کے ذریعے سے شائع ہوں یا کسی دوسرے ذریعہ سے پہنچیں، پوری توجہ کی جائے اور ان کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔

(د) حکومت کے کاموں میں پبلک کے اہلِ فکر و نظر اور واقف کار لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(ہ) وزراء بڑی بڑی تنخواہیں لے کر وزارت کے ٹھاٹھ نہ جمائیں اور نہ پبلک سے دور رہیں۔ ان کو اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے بجائے اپنا معیارِ اخلاق اور معیارِ خدمت بلند کرنا چاہیے اور عوام سے دور رہنے کے بجائے اور زیادہ قریب ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی حکومت کے تحت ملک کے حالات سے براہِ راست واقف ہوں اور حالات کی اصلاح کریں۔

(و) پبلک کے روپے اور حکومت کی مشینری کو پارٹی کی اغراض کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ نہ حاکمانہ

---

[۱] ان اصولوں کے تحت اپنے تفصیلی ضوابط بنانا پارٹی کا اپنا کام ہے۔

اختیارات سے کسی اور طرح کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔

(ز) حکومت کے اختیارات کو مخالف سیاسی پارٹیوں کے خلاف استعمال نہ کیا جائے۔

(ح) مغربی ڈپلومیسی کے طریقے ترک کر کے حکومت کا کام سچائی اور راستبازی کے ساتھ چلایا جائے۔

(ط) ہر قیمت پر وزارت سے چمٹے رہنے کی کوشش نہ کی جائے۔ مرکز اور اس کے گورنر کا آلہ کار بننے سے قطعی انکار کر دیا جائے۔ اپنے عقیدہ و مقصد کے مطابق اپنے اصلاحی پروگرام کو نافذ کرنے پر اصرار کیا جائے۔ اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو وزارت سے استعفاء دے دیا جائے۔

(۳) اگر یہ پارٹی اقلیت میں ہو لیکن دوسری پارٹیوں کے ساتھ مشترکہ وزارت بنانے کا امکان ہو تو صرف اس صورت میں اس امکان سے فائدہ اٹھایا جائے جبکہ

(الف) مشترکہ وزارت میں شریک ہونے والی پارٹیاں اس پارٹی کے عقیدہ و مقصد سے اور اس منشور کے اصلاحی پروگرام یا کم از کم اس کے اصولوں سے متفق ہوں۔

(ب) وہ اسی پالیسی پر عمل کرنے کا اقرار کریں جو اوپر نمبر ۲ میں بیان کی گئی ہے۔

(۴) اگر اس پارٹی کو اپوزیشن میں رہنا پڑے تو وہ کبھی اختلاف برائے اختلاف نہ کرے بلکہ حق کی موافقت اور باطل کی مخالفت کے اصول پر عامل ہو۔

اصلاحی پروگرام

جن اصلاحات کو نافذ کرنے کی کوشش اس پارٹی کو لازماً کرنی چاہیے، خواہ یہ برسرِاقتدار ہو یا اپوزیشن میں رہے، وہ حسب ذیل ہیں۔

اصلاح قوانین

(۱) صوبائی سیفٹی ایکٹ کو ختم کرنا اور کسی ایسے قانون کو باقی نہ رہنے دینا جو انتظامی حکام کو کھلی عدالت میں کسی شخص کا جرم ثابت کیے بغیر، اور اس کو صفائی کا موقع دیئے بغیر شخصی آزادی، یا آزادیٔ نقل و حرکت، یا آزادیٔ تقریر و تحریر، یا آزادیٔ اجتماع سے محروم کر دینے کا اختیار دیتا ہو، یا انہیں افراد اور گروہوں کی جائز آئینی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے، یا ان کو اپنے ایمان و ضمیر کے خلاف کسی کام پر مجبور کرنے کے اختیارات دیتا ہو۔ نیز ایسے قوانین کو بھی تبدیل کرنا جو حکومت کو وہ حقوق دیتے ہیں جو دراصل ریاست کے حقوق ہیں۔

(۲) پریس کو اُن تمام ناروا پابندیوں سے آزاد کرنا جو انگریزی حکومت نے اپنے استبداد کی حفاظت کے لیے عائد کی تھیں۔

(۳) صوبائی اسمبلی کے اختیارات کی حد تک ایسے تمام قوانین میں ترمیم کرنا جن میں کوئی چیز اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔

(۴) ۱۹۳۵ء کے موجودہ ترمیم شدہ ایکٹ کی ایسی تمام دستوری رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی پر زور ڈالنا جن کی موجودگی میں شریعت کے منشا کے مطابق اصلاحی قوانین بنانا اور نافذ کرنا مشکل ہے۔

(۵) شرعی قوانین کو عدالتوں میں نفاذ کے قابل بنانے کے لئے اِن قوانین کی تدوین و ترتیب اور تعلیم کا انتظام کرنا۔

(۶) شریعت کے منشا اور احکام کے مطابق معاشرے کی اصلاح کے لیے نئے قوانین بنانا۔

اصلاح نظم و نسق

(۱) سرکاری محکموں سے رشوت، خیانت، اور دوسری بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کو دور کرنے کی تدبیریں اختیار کرنا۔

(۲) تمام ایسے اداروں میں، جہاں سرکاری ملازموں کے لیے کارکنوں کی تربیت کی جاتی ہے، اخلاقی و دینی تعلیم و تربیت لازم کرنا تاکہ ان سے ایسے افسر تیار ہو کر نکلیں جو صرف قابل ہی نہ ہوں بلکہ خدا ترس، متدیّن اور فرض شناس بھی ہوں۔

(۳) پبلک کے ساتھ سرکاری ملازموں کے رویہ کو درست کرنا۔

(۴) سرکاری ملازموں کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہوں کے لیے ایک منصفانہ حد مقرر کرنا۔

(۵) انگریزی دور کے ضوابط ملازمت میں ایسی اصلاحات کرنا جن سے وہ معقول، منصفانہ اور اسلام کے اخلاقی تقاضوں کے مطابق ہو جائیں۔

(۶) انگریزی زبان کو سرکاری محکموں سے رخصت کرنا اور اس کی جگہ اردو کے استعمال کو رواج دینا۔ اس سلسلے میں اسمبلی کی اسلامی پارٹی کا اولین قدم یہ ہو کہ وہ خود اسمبلی میں صرف اردو کے استعمال پر اصرار کرے۔

(۷) سرکاری افسروں کے لیے سرکاری ڈیوٹی کے وقت انگریزی لباس کے استعمال کو ممنوع کرنا اور

ایسے تمام آثار کو مٹانا جن کی وجہ سے عوام الناس ابھی تک انگریزی دور کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہوسکے ہیں۔

(۸) پولیس کے عام طور طریقوں کو درست کرنا اور خصوصاً تفتیش کے تمام وحشیانہ اور غیر مہذب طریقوں کو بند کردینا۔

(۹) سی، آئی، ڈی کو سیاسی کارکنوں کے پیچھے لگانے کے بجائے جرائم کی روک تھام، تحقیقات، اور رشوت خور سرکاری ملازموں کی نگرانی میں استعمال کرنا۔

(۱۰) پولیس کے شعبۂ احتساب (PROSECUTION) اور شعبۂ تفتیش (INVESTIGATION) کو عملاً علیحدہ کرنا (جو اَب محض برائے نام الگ ہیں)

(۱۱) جیل کے تمام وحشیانہ اور غیر مہذب ضابطوں کو مہذب اسلامی طریقوں کے مطابق بدلنا، اسے دارالعذاب اور جرائم کی تربیت گاہ کے بجائے قیدیوں کی اخلاقی و ذہنی اصلاح کی جگہ بنانا، اور اس میں ایسے طریقے رائج کرنا جن سے مجرمین شریفانہ زندگی کے قابل بن سکیں۔

(۱۲) عدالتی ضوابط کو اسلام کے مطابق بدلنا۔

(۱۳) اسلام کے منشا کے مطابق کورٹ فیس کو بتدریج ختم کرکے انصاف کی بلامعاوضہ بہم رسانی کا انتظام۔

(۱۴) عدالتوں کو انتظامی حکومت کی دخل اندازیوں سے محفوظ کرنا۔

(۱۵) انتظامی حکومت اور اس کے عملے کی ان تمام امتیازی خصوصیات کو ساقط کرنا جن کی وجہ سے انصاف کے معاملے میں عدالتوں کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔

(۱۶) اسلام کے منشا کے مطابق پیشۂ وکالت کی اصلاح۔

اصلاحِ تعلیم

(۱) نظریۂ تعلیم، طریقۂ تعلیم، نصابِ تعلیم، اور درسگاہوں کے ماحول میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کرنا کہ اس صوبے کا نظامِ تعلیم ایک طرف پاکستانی معاشرے کے لیے خداپرست اور نیک سیرت شہری، کارکن اور لیڈر فراہم کرنے کے قابل ہو، اور دوسری طرف پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر بھی ہو۔

(۲) اساتذہ کی ٹریننگ کے موجودہ انتظامات کو جلدی سے جلدی اس طرح درست کرنا کہ وہ مذکورۂ بالا مقصد کے لئے مناسب استاد تیار کرسکیں۔

(۳) صوبے کی موجودہ تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے مدارس کی توسیع، اور مفت جبری ابتدائی تعلیم کا طریقہ رائج کرنے کی طرف بتدریج اقدام۔

(۴) تعلیم بالغان کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش۔

(۵) مخلوط تعلیم کا قطعی انسداد اور لڑکیوں کے لیے جداگانہ تعلیم کا اطمینان بخش انتظام۔

(۶) اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش۔ اس غرض کے لیے حیدر آباد میں اب تک جو کام ہو چکا ہے اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور آئندہ مزید کام کے لئے ایک محکمۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جائے۔

(۷) صوبے کے معیارِ تعلیم کو بلند کرنے کے لیے اس امر کی کوشش کہ زیادہ سے زیادہ قابل لوگ مدرسوں اور کالجوں کو حاصل ہو سکیں اور اطمینان قلب کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دیں۔

(۸) عربی مدارس کو موجودہ کس مپرسی کی حالت سے نکالنا اور ان کے معیار کو بلند کر کے ہر حیثیت سے سرکاری درسگاہوں کے برابر لانا۔ نیز اس امر کی کوشش کہ بالآخر دینی و دنیوی تعلیم کے دائرے الگ نہ رہیں بلکہ ایک ہی تعلیمی نظام ہم کو دین و دنیا کے جامع آدمی فراہم کرنے لگے۔

(۹) صوبے کی خاص اور ملک کی عام ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک منصوبے کے مطابق مختلف اقسام کی فنی (TECHNICAL) تعلیم کا انتظام۔

زرعی اصلاحات

(۱) زرعی املاک کی تحقیقات اور جدید بندوبست کے لیے اسلامی قانون کے مطابق ایک ایسا با اختیار بورڈ مقرر کرنا جو اسلامی شریعت کے علما اور محکمۂ مال کے تجربہ کار افسروں پر مشتمل ہو اور حسبِ ذیل اصولوں پر موجود الوقت جاگیروں اور زمینداریوں کی تحقیقات کر کے ان کا نیا بندوبست کرے:

(الف) تمام ایسی جاگیریں واپس لے لی جائیں جو کسی سابق حکومت نے کسی ناجائز (یعنی پاکستان کے اسلامی یا قومی مفاد کے خلاف) خدمت کے صلے میں عطا کی ہوں۔

(ب) ایسی جاگیریں بھی واپس لے لی جائیں جو کسی سابق حکومت نے سرکاری املاک میں سے عطا کرنے کے بجائے لوگوں کی ملکیتیں غصب کر کے جاگیردار کو بخش دی ہوں، یا پرانے مالکوں کو زبردستی جاگیردار کا

مزارع بنا دیا ہو۔

(ج) وہ جاگیریں بھی واپس لی جائیں جو بعض مخصوص خدمات کی انجام دہی کے لیے عطا کی گئی ہوں مگر یا تو وہ خدمات اب انجام نہ دی جارہی ہوں، یا ان خدمات کی اب ضرورت نہ ہو۔

(د) جن جاگیرداروں کو جائز خدمات کے صلے میں سرکاری املاک واجبی حدود سے زائد مقدار میں دی گئی ہوں، ان سے وہ زائد مقدار واپس لے لی جائے۔ واجبی حدود سے مراد اس قدر رقبۂ اراضی ہے جو کسی علاقے میں ایک خاندان کی متوسط خوشحال زندگی کے لیے کافی ہو)

(ہ) ایسی تمام زمینیں بھی واپس لے لی جائیں جو اگرچہ جائز سرکاری عطیہ ہوں مگر تین سال یا زائد مدت سے غیر آباد پڑی ہوں۔

(و) وہ تمام زمینداریاں بھی منسوخ کردی جائیں جن پر شرعی نقطۂ نظر سے زمیندار کا حق ملکیت ثابت نہ ہو۔

(ز) مذکورۂ بالا طریقوں سے جو زمینیں واپس لی جائیں ان میں سے آباد زمینوں پر انہی لوگوں کو حقوقِ ملکیت دے دیئے جائیں جو فی الحال انھیں آباد کر رہے ہیں، اور غیر آباد زمینوں کو انصاف کے ساتھ مستحق لوگوں میں تقسیم کردیا جائے۔

(۲) تمام ایسے چشمہ زاروں، چراگاہوں، اور جنگلات کو پبلک مفاد کے لیے عام کرنا جن کو اسلامی شریعت کی رو سے پبلک مفاد کے لیے عام ہونا چاہیے لیکن ابھی تک وہ کسی کی ملکیت میں ہوں۔

(۳) قابل کاشت افتادہ زمینوں کی آبادکاری کا انتظام، اور نا قابلِ کاشت زمینوں کی اصلاح کے لئے ایک منصوبے کے مطابق سعی۔

(۴) زرعی املاک پر اسلامی قانونِ میراث کا فوری اور عملی نفاذ۔ یہ نفاذ صرف آئندہ ہی کے لئے نہ ہونا چاہیئے بلکہ جن زندہ مستحقین کے حقوقِ وراثت پہلے سلب ہو چکے ہیں ان کی حق رسانی بھی ہونی چاہیے۔

(۵) زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی تقسیم کا قطعی خاتمہ۔

(۶) مالکانِ اراضی اور کاشت کاروں کے درمیان انصاف قائم کرنے کے لئے حسب ذیل اصلاحات کا نفاذ:

(الف) کاشتکار کو کم سے کم اتنا قطعۂ زمین اور اتنا حصۂ پیداوار لازماً دیا جائے جو بلحاظ اوسط اس کی بنیادی ضروریات کے لیئے کفایت کر سکے۔

(ب) پیداوار کے مقرر حصے یا طے شدہ لگان کے سوا مالکان زمین کو کاشتکاروں سے کوئی ٹیکس، یا کوئی بلامعاوضہ خدمت لینے کا حق نہ ہو۔

(ج) مخصوص قانونی وجوہ کے سوا کسی کاشتکار کو زمین سے بے دخل نہ کیا جا سکے (یہ مخصوص قانونی وجوہ پورے انصاف کے ساتھ ماہرینِ شریعت اور زرعی معاملات کا تجربہ رکھنے والے افسروں اور وکلاء کی ایک مجلس تجویز کرے، اور اس تجویز میں جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر مالکانِ زمین اور کاشتکاروں کے نقطۂ نظر کا جائزہ لے لیا جائے۔

(د) مالکوں اور کاشتکاروں کی باہمی شکایات رفع کرنے کے لئے ان کی مشترک پنچائتیں قائم کی جائیں۔

(۷) کاشتکاروں کو علمِ زراعت کی جدید ترقیات سے مستفید ہونے کے مواقع زیادہ سے زیادہ وسعت کے ساتھ بہم پہنچائے جائیں۔

(۸) امداد باہمی کے اصولوں پر وسیع پیمانے کی کاشت (LARGE SCALE FARMING) کا طریقہ رائج کیا جائے تاکہ لوگوں کے شخصی حقوق بھی محفوظ رہیں اور سائنٹفک ذرائع سے استفادہ بھی ممکن ہو۔

صنعتی اصلاحات

(۱) تمام ایسی صنعتوں کی بحالی جنھیں تقسیم ملک سے نقصان پہنچا ہے۔

(۲) تمام ایسی صنعتوں کے قیام کی کوشش جن کے کاریگر صوبے میں موجود ہیں مگر اپنی صنعت کا آغاز کرنے یا اسے قابلِ اطمینان طریقے سے بڑھانے کے قابل نہیں ہیں۔

(۳) ایسی نئی صنعتوں کا اجراء جن کے لئے خام اجناس ملک میں موجود ہیں اور جنھیں کم سرمائے سے شروع کیا جا سکتا ہے۔

(۴) صوبے کی مصنوعات کو غیر ملکی مقابلے سے بچانے کی کوشش۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ حکومت حتی الامکان خود اپنی ضروریات کے لیئے ایسی غیر ملکی اشیا نہ خریدے جن کا بدل ملک میں بہم پہنچ سکتا ہو۔

(۵) نظامِ صنعت میں جہاں تک ممکن ہو اجارہ داری (MONOPOLY) کا سد باب۔

(۶) محنت پیشہ لوگوں کو اسلامی اصولِ عدل کے مطابق واجبی حقوق دلوانے، اور اجیر و مستاجر کے درمیان انصاف قائم کرنے کے لئے حسب ذیل اصلاحات کا نفاذ:

(الف) کم سے کم منصفانہ معاوضے اور اوقاتِ کار کی قانونی حد بندی،

(ب) جائز اور معقول وجوہ کے بغیر اجیر کی برخاستگی کا ممنوع ہونا،

(ج) مضرِ صحت حالات میں اجیروں کو رکھنے اور ان سے کام لینے کی ممانعت،

(د) بیماری اور مشینی حادثات کی صورت میں اجیروں کے علاج کا انتظام،

(ہ) ناقابلِ کار ہوجانے کی صورت میں، نیز بڑھاپے کی صورت میں پنشن کا انتظام،

(و) اجیروں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام،

(ز) ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں سے محنت لینے کی ممانعت،

(ح) عورتوں اور مردوں سے یک جا کام لینے کی ممانعت،

(ط) اجیروں اور مستاجروں کی مشترکہ پنچایتوں کا قیام، تاکہ شکایات کا باہمی گفت و شنید سے ازالہ ہوسکے،

(ی) جو معاملات پنچایت میں طے نہ ہوسکیں ان کے تصفیہ کی ذمہ داری حکومت اپنے اوپر لے اور کسی صنعتی ادارے میں ہڑتال یا دربندی کی نوبت نہ آنے دے۔

تجارتی اصلاحات

(۱) احتکار اور ناجائز نفع اندوزی کا سختی کے ساتھ استیصال۔

(۲) خرید و فروخت کی اُن تمام شکلوں کو ازروئے قانون بند کرنا جو شرعاً ممنوع ہیں۔

(۳) ایسی تمام چیزوں کی صنعت اور تجارت کو بند کرنا جو شریعت کی رو سے ناجائز ہیں۔

(۴) تجارت کو فروغ دینے کی ایسی تمام تدبیروں کو روکنا جو فریب، جھوٹ، اور فحش کی تعریف میں آتی ہوں۔

(۵) جہاں تک صوبائی حکومت کے اختیار میں ہے جائز کاروبار کے فروغ کے لیے تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچانا اور اُن اسباب کو رفع کرنا جن کی وجہ سے تجارت پیشہ لوگوں کے لئے اپنے کاروبار کو جائز طریقوں سے ترقی دینا مشکل ہوتا ہے۔

عام معاشی اصلاحات

(۱) زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کی تحصیل کا انتظام۔ اس انتظام میں یہ گنجائش بھی رہے کہ

لوگ اپنے صدقاتِ نافلہ اور اپنی عام خیرات بھی اگر حکومت کو دینا چاہیں تو دے سکیں۔

(۲) اسلامی اوقاف کی اصلاح و تنظیم، اور ایسے اوقاف کو سرکاری انتظام میں لے لینا جو نااہل ہاتھوں میں ہوں، یا واقفین کے منشا کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہوں، یا جن کی شرائطِ وقف اس کی گنجائش دیتی ہوں کہ حکومت ان کی تولیت خود اپنے ہاتھ میں لے سکے۔

(۳) مذکورۂ بالا مدات سے جو آمدنیاں حاصل ہوں اُن سے شرعی قواعد کے تحت حسبِ ذیل امور کا انتظام کرنا۔

(الف) معذور اور اپاہج لوگوں کی پرورش، اور ایسے بوڑھے لوگوں کی پنشن جو اور کوئی سہارا نہ رکھتے ہوں۔

(ب) یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت۔

(ج) بے روزگار لوگوں کی اعانت، جب تک کہ وہ کوئی روزگار حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔

(د) ایسے قابلِ کار لوگوں کی اعانت جو کچھ سہارا پا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں۔

(ہ) حاجتمند لوگوں کو قرضِ حسن۔

(و) نادار بیماروں کا معالجہ۔

(ز) غریب لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں امداد۔

(ح) غریب طلبہ کے لیے وظائف۔

(ط) مساجد اور معاہدِ دینیہ کی اصلاحِ حال۔

(ی) علمی اور دینی خدمات انجام دینے والوں کی مستقل یا وقتی اعانت۔

(ک) علمی اور دینی اداروں کی امداد۔

(۴) حتی الامکان اصلاحی تدابیر سے اور حسبِ ضرورت قانونی ذرائع سے تعیشات اور اسراف و تبذیر کی روک تھام۔

ترقیاتِ عامہ

(۱) کم تنخواہ پانے والے ملازمین اور عام غریب طبقوں کے لیے کم کرایہ کے صحت بخش مکانات کی تعمیر۔

(۲) دیہی علاقوں میں سڑکوں کا انتظام، یہاں تک کہ ہر گاؤں کا تعلق اپنے قریب کی کسی شاہراہ سے قائم ہو جائے۔

(۳) پنجاب کو بھارت کی بجلی کا محتاج نہ رہنے دینا۔

(۴) پنجاب کو اس مستقل خطرے سے محفوظ کرنا کہ بھارت کسی وقت اپنی نہروں کا پانی بند کر کے اس کی خوش حالی کا خاتمہ کر دے۔

(۵) صنعتی ترقی کے لئے مزید برقی طاقت کی فراہمی۔

قومی صحت

(۱) کسی باشندے کو محض اس بنا پر علاج سے محروم نہ رہنے دیا جائے کہ وہ معالج کی فیس اور دوا کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس غرض کے لیے حسب ذیل تدابیر عمل میں لائی جائیں:

(۱ الف) ڈاکٹروں اور طبیبوں کی فیسوں پر کنٹرول۔

(ب) دواؤں کی قیمتوں پر کنٹرول۔

(ج) سرکاری شفاخانوں اور دایہ گھروں کی تدریجی توسیع۔

(د) علاج کی سہولتوں کو عام کرنے کے لئے ایلوپیتھی کی طرح یونانی طب اور ہومیوپیتھی کے شفاخانے بھی سرکاری طور پر قائم کرنا (اس غرض کے لئے ضروری ہوگا کہ ان دونوں طریقہائے علاج کو وہی سرکاری سرپرستی حاصل ہو جو اب تک صرف ایلوپیتھی کو حاصل رہی ہے)۔

(۲) دق، وبائی امراض، اور جنسی امراض کی روک تھام پر خصوصی توجہ۔

(۳) غذا اور دواؤں میں آمیزش کو پوری سختی کے ساتھ بند کرنا۔

(۴) شہروں اور دیہات میں حفظانِ صحت کا اطمینان بخش انتظام۔

(۵) حفظانِ صحت، تیمارداری، وباؤں کی مدافعت، غذائیات، اور فوری طبی امداد (FIRST AID) کے متعلق ضروری معلومات کو مدارس کے نصاب اور تعلیم بالغان کے نصاب میں شامل کرنا، نیز ان معلومات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور عوام میں صفائی کی حس پیدا کرنے کے لئے دوسری ممکن تدابیر اختیار کرنا۔

معاشرے کی اصلاح و تعمیر

(۱) قانون اور انتظام کی تمام طاقتوں اور حکومت کے تمام ذرائع و وسائل سے کام لے کر معاشرے کو ہر قسم کے فواحش اور بداخلاقیوں سے پاک کرنا۔

(۲) اُن تمام اسباب کی روک تھام کرنا جو معاشرے میں اخلاقی مفاسد کی تحریک اور اشاعت کے موجب بنتے ہیں۔

(۳) نظام معاشرت کی ان خرابیوں کو دور کرنے کی طرف خاص توجہ کرنا جن کی وجہ سے لوگوں کی اخلاقی و معاشی حالت کو نقصان پہنچتا ہے، یا خاندان کے استحکام پر زد پڑتی ہے، یا نکاح میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں یا حقوق و فرائض کے اُس توازن میں خرابی واقع ہوتی ہے جو اسلام نے عورتوں اور مردوں کے درمیان قائم کیا ہے۔

(۴) جس حد تک حکومت کے وسائل سے ممکن ہے اخلاقِ عامہ کی اصلاح اور عوام کی ذہنی تربیت کے لئے ایسے انتظامات کرنا جن سے لوگوں میں سچی خدا پرستی اور خدا ترسی پیدا ہو، اپنی اخلاقی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون اور برائی کے کاموں میں عدم تعاون کی اسپرٹ پیدا ہو، قانون کے احترام کا جذبہ اور اجتماعی مفاد کا درد پیدا ہو، اور عوام الناس اس قابل ہوسکیں کہ برائیوں کے انسداد، بھلائیوں کی ترویج اور اجتماعی فرائض کی ادائیگی کا دار و مدار محض قانونی جبر پر نہ رہے بلکہ لوگوں کی اپنی اخلاقی حس ان کاموں کے لیے کافی ہو۔

(۵) عوام کو تنظیم اور تعاون کی تربیت دینے کے لئے امداد باہمی کے طریقوں اور پنچایتی نظام کی ترویج۔

(۶) مساجد کو تہذیبِ ملت کے مراکز بنانے کے لیے ائمہ و خطبا کی تنظیم، ان کے لئے تربیت گاہوں کا قیام، ان کو باعزت طریقے سے معاوضے دلوانے کا انتظام، مساجد کے موجودہ نظام تولیت کی اصلاح، مساجد میں قرآن و حدیث کے درس کا اجرا اور دارالمطالعوں کا قیام۔ (اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہنی چاہیے کہ مسجدیں اقتدار کے بت کی پرستش گاہوں میں تبدیل نہ ہونے پائیں۔ حکومت مسجدوں کی خادم ہو نہ کہ ان کی حاکم اور ان کے منبروں کی اجارہ دار)

(۷) شہری دفاع کے لیے عوام کو وسیع پیمانے پر تیار کیا جائے اور اس کے لئے حسبِ ذیل تدبیریں خصوصیت کے ساتھ اختیار کی جائیں:

(الف) لوگوں میں جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونکی جائے اور قوم پرستی یا وطن پرستی کے بجائے اُس نظامِ زندگی کی حفاظت کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے جس کے برحق ہونے پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

(ب) سرکاری ملازمین اور زیرِ تعلیم طلبہ کو دفاع کی تربیت دینے کا خاص اہتمام۔

(ج) عوام کو ایک مقرر منصوبے کے مطابق دفاعی تربیت دینے کا وسیع انتظام، تاکہ چند سال کے اندر صوبے کا ہر فرد اسلحہ کے استعمال اور دفاعی تدابیر سے واقف ہو جائے (اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ حکومت اپنے شہریوں کو بے اعتمادی کی نگاہ سے دیکھنا چھوڑ دے اور ان پر یہ بھروسہ کرے کہ وہ خود اپنے ملک کے دشمن نہیں ہیں)۔

(د) اسلحہ کے لائسنس عطا کرنے کے معاملے میں ان بیجا پابندیوں کا خاتمہ جو انگریزی حکومت نے اس ملک کے لوگوں کو نہتا اور بزدل بنانے کے لئے عائد کر رکھی تھیں۔

(ہ) اے، آر، پی اور فرسٹ ایڈ کے تربیتی مراکز میں توسیع۔

(و) عورتوں کو اسلامی پردہ کے حدود میں رہتے ہوئے دفاعی تربیت دینے کا انتظام۔

مالیات

(۱) صوبے کے خزانے کو بتدریج ایسی آمدنیوں سے پاک کیا جائے جو اسلامی شریعت کی رو سے حرام ہیں، یا اسلام کی معاشی پالیسی کے خلاف ہیں۔

(۲) رفاہ عام کے کاموں سے اور اُن تجارتی کاموں سے جو سرکاری انتظام میں چلائے جا رہے ہوں، بے جا نفع اندوزی نہ کی جائے۔

(۳) جہاں تک صوبہ کی حکومت کے بس میں ہے وہ اپنے حدود اختیار کے اندر سود کو بند کر دے اور ہمسایہ صوبوں اور مرکزی حکومت پر بھی دباؤ ڈالے کہ وہ اس پالیسی میں پنجاب کے ساتھ تعاون کریں۔ تاہم اگر مرکز اور ہمسایہ صوبوں کا تعاون حاصل نہ ہو تو کچھ نقصان اٹھا کر بھی اِس برحق پالیسی کا آغاز کرنے میں تامل نہ کیا جائے۔

(۴) ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کے طریقوں میں ایسی اصلاحات کی جائیں کہ ٹیکسوں کا بوجھ انصاف کے ساتھ ہر طبقے پر اس کی استطاعت کے مطابق پڑے اور ٹیکسوں سے بچنے کے لئے معاشرے میں جھوٹ، خیانت، اور جعل و فریب کی بیماریاں نہ پھیلیں۔

(۵) اس منشور میں جو اصلاحی پروگرام تجویز کیا جا رہا ہے اس کے مالی بار کو سہارنے کے لیے حسب ذیل تدابیر پر اعتماد کیا جائے۔

(الف) نظم ونسق اور معاشرے کی اخلاقی اصلاح جس سے رشوت، خیانت، غبن، نا فرض شناسی اور ادائے محاصل سے اجتناب کی بیماریاں دور ہوں۔ اس اصلاح سے لازماً حکومت کی آمدنی بڑھے گی اور مصارف کم ہوں گے۔

(ب) حکومت کے مصارف میں اسراف کی تمام موجودہ صورتوں کا انسداد اور آئندہ کے لیے ان کی روک تھام۔

(ج) اصلاح و تعمیر اور ترقی کے اس پروگرام کی اہمیت پبلک کے ذہن نشین کرنا اور اجتماعی مفاد کے ساتھ پبلک کی دلچسپی اور ہمدردی کو ابھارنا، نیز کارکنانِ حکومت کی دیانت و امانت کا اعتماد عوام کے دلوں میں قائم کرنا۔ اس طریقے سے حکومت کو رضا کارانہ مالی امداد عطیوں اور قرض حَسَن کی شکل میں ملنا بآسانی ممکن ہے۔

(د) بدرجۂ آخر مزید ٹیکس عائد کرنا، جسے پبلک ایسی صورت میں بخوشی قبول کر سکتی ہے جب کہ اسے اس اصلاحی پروگرام کی افادیت کا بھی یقین ہو اور اس امر کا اطمینان بھی حاصل ہو کہ جو کچھ لوگوں سے لیا جائے گا وہ ایمانداری کے ساتھ انھی کے مفاد پر خرچ ہو گا۔

مہاجرین

اس مسئلے کی بیشتر پیچیدگیاں مرکزی پالیسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ صوبائی حکومت کے دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے جو کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے وہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) مہاجرین کے مسائل کو حل کرنے میں خود مہاجرین کے معتمد علیہ نمائندوں کے مشورے سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(۲) جہاں تک ممکن ہو الاٹمنٹ منصفانہ بھی ہوں اور مستقل بھی تاکہ ہر شخص جہاں بٹھایا جائے وہاں وہ مطمئن ہو کر کام کرے۔

(۳) جو خاندان منتشر ہو گئے ہیں ان کو یک جا ہونے میں پوری ممکن سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(۴) کرایوں اور ملبے کا بوجھ قابل برداشت منصفانہ حد تک ڈالا جائے۔

(۵) کرایوں کے بقایا وصول کرنے کے لیے مہاجرین کو تنگ نہ کیا جائے۔

(۶) کسی مہاجر کو الاٹ کی ہوئی جگہ سے اس وقت تک بے دخل نہ کیا جائے جب تک کہ ایسا کرنا بالکل ہی ناگزیر نہ ہو، اور ناگزیر ہونے کی صورت میں بے دخلی کا عمل اس وقت تک ہرگز نہ ہو جب تک اسے دوسری جگہ مہیا نہ کر دی جائے۔

(۷) مقامی لوگوں کے ناجائز قبضے سے متروکہ جائدادیں نکالی جائیں اور انھیں انصاف کے ساتھ محروم مہاجرین میں تقسیم کیا جائے۔

(۸) مہاجرین کی زائد آبادی کے لیے مکانات کی تعمیر کا انتظام کیا جائے۔

(۹) جو مہاجرین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں مگر سہارے کے محتاج ہیں ان کی اعانت کی جائے۔

غیر مسلم اقلیتیں

(۱) اقلیتیں اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے جس قسم کے قوانین منظور کرنا چاہیں ــــ بشرطیکہ وہ دوسروں کے حقوق پر اثر انداز نہ ہوں ــــ انھیں پاس کرانے میں ان کی مدد کی جائے۔

(۲) ان کو اپنے مذہبی و تہذیبی معاملات میں حکومت کے وسائل سے جس جائز امداد کی ضرورت ہو وہ کشادہ دلی کے ساتھ دی جائے۔

(۳) ان کے مذہبی و معاشرتی معاملات میں کوئی بے جا مداخلت نہ ہونے دی جائے۔

(۴) انھیں اکثریت کے طرز عمل یا حکومت کے نظم و نسق سے جو بھی معقول شکایات ہوں انھیں رفع کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؀

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

جن کو پاکستان کے ہر مکتب خیال اور تمام اسلامی فرقوں کے مشاہیر علماء نے متفقہ طور پر مرتب کیا ہے

[شاید تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے فرقوں کے اکابر علماء نے بالاتفاق وہ اصول مرتب کیے ہیں جن پر قرآن و سنت کے منشا کے مطابق ایک اسلامی ریاست کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے اشخاص اور افراد متفرق طور پر تو بارہا ان مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات بیان کرتے رہے ہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک مجلس میں بیٹھ کر مختلف عقائد و مسالک کے نمائندہ علماء نے خالص علمی بحث و تحقیق کے بعد اسلامی مملکت کے تصور اور اس کے بنیادی اصولوں کے متعلق اس قدر واضح اور مستند بیان تیار کیا ہو۔ یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر اب تک کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی اور توقع کی جا سکتی ہے کہ انشاء اللہ ہماری آئندہ تاریخ کی تشکیل میں اس کا حصہ نہایت اہم ہوگا۔ اب کسی کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ مسلمان جیسی کچھ بھی حکومت بنا بیٹھیں وہ "اسلامی حکومت" ہے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام ایک دین کی حیثیت سے ریاست اور سیاست کے لیے اپنے کچھ مخصوص اصول رکھتا ہی نہیں ہے! اب کسی کے لیے یہ موقع باقی نہیں رہا ہے کہ اپنے خود ساختہ بنیادی اصولوں اور دستوری خاکوں پر "اسلامی" لیبل لگا کر جعلی نوٹوں کی طرح انھیں بازار میں چلا سکے۔ اب یہ دعویٰ کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمان فرقوں کے مذہبی نزاعات ایک اسلامی حکومت کے قیام میں مانع ہیں۔ اب اس جاہلانہ بدگمانی کے فروغ پانے کا بھی امکان نہیں رہا ہے کہ دورِ جدید میں ایک ترقی پذیر ریاست کے لئے

اسلام کے اصولِ سیاست موزوں نہیں ہیں۔ اب یہ جھوٹ بھی نہیں چل سکتا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ علماء پاکستان کے مستند اور متفق علیہ بیان نے ان تمام غلط فہمیوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ یہ بیان ایک ایسا چارٹر ہے جو خدا کے فضل سے صرف پاکستان ہی کی حکومت کا سنگِ بنیاد ثابت نہ ہوگا بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں کے لیے بھی مشعلِ راہ بنے گا۔ جن مسلمان ملکوں میں اس وقت تک لادینی ریاستوں کی نقل اتاری جا رہی ہے، وہ سب انشاء اللہ اس چارٹر سے ہدایت پائیں گے۔]

ایک مدت دراز سے اسلامی دستورِ مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کا کوئی دستورِ مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علماء متفق ہو سکیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس پریشانی میں ان مختلف دستوری تجویزوں نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علماء کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی دستور کے بنیادی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان اصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔

اس غرض کے لیے ایک اجتماع بتاریخ ۱۲-۱۳-۱۴-اور ۱۵-ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱-۲۲-۲۳ اور ۲۴-جنوری ۱۹۵۱ء بصدارت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں اسلامی دستور کے جو بنیادی اصول بالاتفاق طے ہوئے ہیں انھیں فائدۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

مجلس دستور ساز پاکستان کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں اُن کے بارے میں اس اجتماع کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ سفارشات اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اس اجتماع کی خواہش تھی کہ اس موقع پر اسلامی اصولوں کے مطابق ایک تفصیلی خاکہ بھی مرتب کردیا جائے چنانچہ اس غرض کے لئے مجلس دستور ساز پاکستان کے صدر سے درخواست کی گئی کہ وہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کا ایک نسخہ اس اجتماع کو مہیا کردیں تاکہ اگر وہ اسلامی اصولوں کے مطابق درست ہو تو اس کی توثیق کردی جائے یا اگر اس میں کچھ کمی ہو تو اسے پورا کردیا جائے اور نئے سرے سے ایک چیز مرتب کرنے میں محنت صرف نہ کرنی پڑے۔ لیکن صاحبِ موصوف نے بعض وجوہ سے اس درخواست کو قبول نہ فرمایا۔ اب یہ اجتماع سر دست ملتوی کیا جاتا ہے اور تمام اسلامی فکر رکھنے والے اصحاب اور اداروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان متفقہ اصولوں کی روشنی میں دستورِ اسلامی کے متعلق اپنی اپنی تجاویز ۱۵۔ مارچ ۱۹۵۱ء تک حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی جیکب لائنز کراچی کے پاس بھیج دیں۔ اس کے بعد جلدی ہی یہ اجتماع دوبارہ منعقد کیا جائے گا اور تمام تجاویز پر غور کرکے ایک تفصیلی خاکہ مرتب کردیا جائے گا انشاء اللہ العزیز۔

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

اسلامی مملکت کے دستور میں حسبِ ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے:-

۱ ــــ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

۲ ــــ ملک کا قانون کتاب وسنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ۔ اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب وسنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کردیئے جائیں گے۔)

۳ ــــ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

۴ ــــ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے معروف کو قائم

کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلّمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵ ــــــ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے کی کوشش کرے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶ ــــــ مملکت بلا امتیازِ مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷ ــــــ باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸ ــــــ مذکورۂ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقع صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹ ــــــ مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انھی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰ ــــــ غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج

کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱۔۔۔۔۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی۔ اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدیّن، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۱۴۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزءاً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶۔۔۔۔۔ جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرتِ آرا سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔۔۔۔۔ ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹۔۔۔۔۔ محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰۔۔۔۔۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی

اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱ ——— ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی، یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگرانھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲ ——— دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس

۱۔ (علامہ) سید سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا)

۲۔ (مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان)

۳۔ (مولانا) شمس الحق افغانی (وزیر معارف۔ ریاست قلات)

۴۔ (مولانا) محمد بدر عالم (استاذ الحدیث۔ دارالعلوم الاسلامیہ۔ اشرف آباد۔ ٹنڈوالٰہ یار۔ سندھ)

۵۔ (مولانا) احتشام الحق تھانوی (مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد۔ سندھ)

۶۔ (مولانا) محمد عبدالحامد قادری بدایونی (صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان۔ سندھ)

۷۔ (مفتی) محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)

۸۔ (مولانا) محمد ادریس (شیخ الجامعہ۔ جامعہ عباسیہ بہاولپور)

۹۔ (مولانا) خیر محمد (مہتمم مدرسہ خیر المدارس۔ ملتان شہر)

۱۰۔ (مولانا مفتی) محمد حسن (مہتمم مدرسہ اشرفیہ۔ نیلا گنبد لاہور)

۱۱۔ (پیر صاحب) محمد امین الحسنات (مانکی شریف۔ سرحد)

۱۲۔ (مولانا) محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر دارالعلوم الاسلامیہ، اشرف آباد۔ سندھ)

۱۳۔ (حاجی) خادم الاسلام محمد امین خلیفہ حاجی ترنگ زئی (المجاہد آباد۔ پشاور صوبہ سرحد)

۱۴۔ (قاضی) عبدالصمد سربازی (قاضی قلات۔ بلوچستان)

۱۵۔ (مولانا) اطہر علی (صدر عامل جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان)

۱۶۔ (مولانا) ابوجعفر محمد صالح (امیر جمعیت حزب اللہ مشرقی پاکستان)

۱۷۔ (مولانا) راغب احسن (نائب صدر جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان)

۱۸۔ (مولانا) محمد حبیب الرحمٰن (نائب صدر جمعیۃ المدرسین، سرسینہ شریف۔ مشرقی پاکستان)

۱۹۔ (مولانا) محمد علی جالندھری (مجلس احرار اسلام پاکستان)

۲۰۔ (مولانا) داؤد غزنوی (صدر جمعیۃ اہلحدیث۔ مغربی پاکستان)

۲۱۔ (مفتی) جعفر حسین مجتہد (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان)

۲۲۔ (مفتی حافظ) کفایت حسین مجتہد (ادارۂ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، لاہور)

۲۳۔ (مولانا) محمد اسمٰعیل (ناظم جمعیت اہلِ حدیث پاکستان، گوجرانوالہ)

۲۴۔ (مولانا) حبیب اللہ (جامعہ دینیہ دار الہدیٰ، ٹیڑھی، خیرپور میر)

۲۵۔ (مولانا) احمد علی (امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ، لاہور)

۲۶۔ (مولانا) محمد صادق (مہتمم مدرسہ مظہر العلوم۔ کھڈہ۔ کراچی)

۲۷۔ (پروفیسر) عبدالخالق (رکن بورڈ آف تعلیماتِ اسلام، مجلس دستور ساز۔ پاکستان)

۲۸۔ (مولانا) شمس الحق فرید پوری (صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ)

۲۹۔ (مفتی) محمد صاحبداد عفی عنہ (سندھ مدرسۃ الاسلام۔ کراچی)

۳۰۔ (مولانا) محمد ظفر احمد انصاری (سکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان)

۳۱۔ (پیر صاحب) محمد ہاشم مجددی (ٹنڈو سائیں داد۔ سندھ)

حق اور باطل

نعیم صدیقی

(۲)

دوسرا سوال

دوسرا سوال جو اسلام کے نظام صالح کے قلیل مدت تک چلنے کے بارے میں اٹھایا جاتا ہے اور جس کے اندر دراصل یہ استدلال چھپا ہوتا ہے کہ جب ایک نظام اپنے آپ کو زیادہ دیر تک زندہ رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تو آخر اس کے لئے بیش بہا قربانیاں کیوں دی جائیں اور اس کے بجائے کیوں نہ کسی دوسرے نظام کو اختیار کر لیا جائے ——— اپنے جواب میں متعدد ضروری تصریحات چاہتا ہے۔ ہم ان تصریحات کو نمبروار درج کرتے ہیں :-

اول :-

اگر کسی اصول یا نظام کو قبول کرنے اور اسے عملاً برپا کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لئے شرطِ اول یہ ہوتی کہ اس کا ماضی میں دیر تک چلنا ثابت کر دیا جائے تو شاید نہ دینِ جمہوریت کو کوئی کارکن ملتا اور نہ دینِ اشتراکیت کو۔ ان دونوں نظاموں میں سے کسی ایک کو بھی ماضی کی تاریخ میں قدم جمانے کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کے علمبرداروں نے اپنے لئے صرف یہ بات کافی سمجھی کہ ان کا عقلی اطمینان ہو جائے۔ جب ان کے دلوں نے یہ گواہی دی کہ یہ اصول و نظام برحق ہے اور افادیت اسی میں ہے تو پھر انھوں نے اس کے لئے بازی لگا دی۔ وہ احمق ہوتے، اگر عقلی اطمینان کے بعد اور دل کے ٹھک جانے کے بعد پھر یہ سوچنے بیٹھ جاتے کہ جب پہلے ہزاروں انسانی نسلیں گزر گئیں اور کسی کو اس اصول و نظام کو قائم کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو آج ہم یہ حرکت کس امید پر کرنے لگے ہیں ؟

ان دونوں رائج الوقت نظاموں کے بخلاف اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لئے تو عملی تحریک کا دوسرا

سامان موجود ہے۔ وہ اپنے لئے عقلی اطمینان کے پورے وجوہ بھی اسلام میں پاتے ہیں، اور پھر وہ تاریخ سے شہادت بھی پاتے ہیں کہ یہ نظام پہلے بھی قائم رہا ہے اور اپنی معیاری شکل میں تیس سال تک ماضی قریب میں چل چکا ہے، جب کہ وسائلِ تمدن موجودہ دور سے بہت کم تھے۔

تعجب ہے کہ جن نظاموں کا کوئی ماضی نہ تھا انھیں جب کارکن مل گئے تو وہ نہ صرف قائم ہوئے بلکہ ساری دنیا پر ان کے اثرات پھیل گئے، لیکن جس نظام کا ایک مضبوط ماضی موجود ہے اس کے کارکن تذبذب میں مبتلا رہیں۔

دوم :-

یہ سمجھنا کہ اسلام دنیا میں صرف ایک بار برپا ہوا اور وہ بھی تیس سال کے لئے، قرآن اور تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے اندر اسلامی نظام کو قائم کیا، پھر یوسف علیہ السلام کے ذریعے یہ مصر میں قائم ہوا اور دیر تک اس کے اثرات قائم رہے، پھر سلیمان علیہ السلام نے اسے برپا کیا اور ایک مدت تک اسے بڑی وسعتوں کے ساتھ چلایا ـــــ اور نہ معلوم تاریخ کے مختلف ادوار میں اور کون کون سے انبیا و صلحا کس کس خطے میں ایسے گزرے ہوں گے جنھوں نے اسی نظام کو بار بار برپا کیا ہوگا (قرآن میں صرف ان اقوام کے انبیا اور ان ملکوں کی دینی تاریخ کا تذکرہ ہے جن سے عرب براہِ راست متعارف تھے) پھر آخری نبی صلعم کے ذریعے بھی نظام حق اپنی معیاری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس پر نہ معلوم لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ اسلامی نظام دنیا میں صرف تیس سال چل کے ختم ہوگیا۔ اسلامی نظام تو بار بار اپنے آپ کو دہراتا چلا آرہا ہے!

بخلاف اس کے کوئی غیر اسلامی نظام ایسا نہیں جو مٹ مٹ کر پھر قائم ہوا ہو۔

سوم :-

صرف تیس سال" کا وہ مفہوم بھی غلط ہے جو معترض حضرات لیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے ساتھ اسلامی نظام بھی بالکل شہید ہوگیا اور اس کی پوری عمارت پیوندِ زمین ہوگئی۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں، اصل صورتِ حالات جو کچھ تھی وہ یہ تھی کہ پورے اسلامی نظام میں سے ایک "اصولِ انتخاب" ساقط کر دیا گیا، باقی سب کچھ جوں کا توں رہا۔ قانون وہی تھا، اقامتِ عبادات کا نظم وہی تھا، جہاد فی سبیل اللہ کی سرگرمیاں

اسی طرح رہیں، معاشرتی نظم وہی رہا، عوامی اخلاق کی حالت ویسی ہی تھی، نظامِ تعلیم اسی طرح تھا۔ اِن بنیادی نظام کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں تو اصولاً ہم یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ نظام بدل گیا، لیکن یہ تبدیلی کلی نہ تھی، بلکہ بگاڑ نے اس قلعے میں گھسنے کا ایک چور دروازہ بنا لیا تھا۔ یہ تبدیلی بہت ہی تدریجی طریق سے واقع ہوئی۔ ایک عمارت میں سے آہستہ آہستہ ایک ایک اینٹ بدلی جاتی رہی اور بہت دیر کے بعد جا کر اس عمارت کا بیشتر حصہ متغیر ہوا۔

اصل میں سارا بگاڑ شاہی محل اور دربارِ خلافت کے اندر برپا ہوا لیکن عوامی زندگی بہ حیثیت مجموعی اسی صالح نقشے پر استوار رہی جیسے دورِ سعادت میں جما دیا گیا تھا۔ یہ حالت سات آٹھ سو سال تک جاری رہی۔ بالکل آخری دو چار صدیاں ایسی تھیں جب کہ عوام میں اخلاقی انحطاط پھیلا، معیشت و معاشرت میں مفاسد گھسے اور سوسائٹی اسلامی بنیادوں سے اکھڑنے لگی، اور انھی صدیوں میں امت کا سفینہ زوال کی موجوں کا شکار ہوا۔ جب تک نظامِ حق کی اصل قدریں زندگی میں غالب رہیں مسلمان ترقی کرتے گئے، اگرچہ ان کے سلاطین و امرا بگڑتے چلے جا رہے تھے، لیکن جب نظامِ حق کی قدریں کمزور پڑ گئیں تو پھر زوال غالب آ گیا۔

یہ اسی تیس سال کے معیاری دور کا کرشمہ تھا کہ اس کی پیدا کردہ اخلاقی قوت ملتِ اسلامیہ کو کئی صدیوں تک ترقی کی راہ پر دوڑاتی چلی گئی اور تاریخ میں سے ان کو ایک لمبا دورِ اقبال عطا کیا گیا۔ اس تیس سال کی پیدا کردہ قوت جب گھٹنے لگی اور اس کی کمی کو پورا کرنے کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کے تمدن کی گاڑی پہلے سست رفتار ہوئی، پھر دھیمی ہوتے ہوتے بالکل رک گئی۔

اس ہزار سال کے دور کو لوگ جب "صرف تیس سال" کے الفاظ میں سمیٹ کر سامنے لاتے ہیں تو ناواقف آدمی کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

چہارم :-

اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس کے علمبرداروں نے نبی صلعم کی قیادت میں جب اسے بہ حیثیت نظام کے قائم کر دیا، تو چاہے وہ بقول معترضین صرف تیس سال چلا ہو ــــــ بہر حال اپنی پوری معیاری شان کے ساتھ چلا۔ نبی صلعم اور آپ کے صحابہ اور مسلمان عوام سب کے سب اس بات پر پوری طرح مطمئن تھے کہ جو کام

ان کو کرنا تھا اسے کما حقہ' انجام دے دیا اور ان کو نہ کوئی معذرت کرنی پڑی، نہ کوئی حسرت لے کر وہ رخصت ہوئے انھیں جیسی زندگی مطلوب تھی، اسے عملاً سو فی صدی معیار پر قائم کر کے دکھا دیا۔

لیکن آج جن نظاموں سے مرعوب ہو کر لوگ "صرف تیس سال" کا سوال اٹھاتے ہیں، انھوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ جمہوریت اور یہ اشتراکیت تو اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق اب تک زمین کے اوپر ایک لمحے کے لئے بھی قائم نہیں ہوئیں۔

جمہوریت کے تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ معیاری جمہوریت ابھی تک کتابی اصولوں میں تو پائی جاتی ہے' سطحِ ارض پر نافذ نہیں ہے۔ برنارڈ شا کے الفاظ میں ابھی بمشکل یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانیت کے لئے تڑکے کا وقت آیا ہے (POCKET HISTORY OF THE WORLD) ہنڈرک دان لون اپنی تاریخِ عالم کے آخر میں کیا خوب کہتا ہے کہ "لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ ابھی ہم درجنوں غلط پگڈنڈیوں کو اختیار کریں گے، تب کہیں جاکر شاید صحیح سمتِ سفر پاسکیں۔"

مارکسزم کے متعلق بھی یہ بالکل واضح ہے۔ اس کے مومنین خود کہتے ہیں کہ ابھی ہم ایک عبوری دور (TRANSITIONAL PERIOD) میں سے گزر رہے ہیں۔ معیاری حالت جو ان کے پیشِ نظر ہے اس میں پہنچنے کے بعد ایک تو ریاست کا وجود ختم ہو جائے گا جسے آج ایک ناگزیر برائی (NECESSARY EVIL) کی حیثیت سے اختیار کیا گیا ہے، اور دوسری تبدیلی یہ آئے گی کہ ہر شخص صرف اپنی قوت و صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور اپنی ضروریات کے مطابق بدلہ پائے گا۔ اس معیاری حالت اور آج کی حالت کے درمیان نہ معلوم کتنی صدیوں کا وقفہ حائل ہے۔ اصل سُرخ جنت مستقبل کے بہت ہی بعید گوشوں میں مستور ہے۔

پس جن نظاموں سے آج ہمیں سابقہ ہے، ان میں سے کوئی بھی اپنی معیاری شکل میں ابھی ایک منٹ کے لئے بھی برپا نہیں ہوا بلکہ ان کے علمبردار ابھی ادھ کچرے نظام لئے چل رہے ہیں۔ بخلاف آن کے اسلام اگر اپنے پیرؤں کو ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے بلاتا ہے تو انھیں ماضی میں اپنے پیش کردہ نظام کو تیس سال تک معیاری شکل میں چلتا ہوا دکھاتا ہے۔ کونسا دوسرا نظام ایسا ہے جو تیس سال نہ سہی، صرف ایک ہی سال کے لئے اپنے اصولوں کا صد فی صد عملی نفاذ تاریخِ انسانی میں دکھا دے۔

پنجم :-

دُنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ایک مرتبہ مٹ جائے تو اس کے احیاء کا جذبہ عوام میں برقرار رہے، یا اس میں اصولی تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں تو ان تبدیلیوں کے خلاف جدوجہد کر کے بنیادی اصولوں کو دوبارہ تازہ کرنے کی فکر کی جائے۔

جن ملکوں میں پاپائیت تھی، وہ جب مٹ گئی تو کوئی نہ تھا جو اُس کے احیاء کا خواہشمند ہو۔ جاگیردارانہ نظام جہاں جہاں شاہ ہاں پھر اس کی تجدید کرنے کے لئے کبھی کوئی تحریک نہ اٹھی۔ سرمایہ داری مٹتی ہے تو کوئی اس کے تنِ مردہ میں دوبارہ جان ڈالنے کے لئے کوشش نہیں کرتا، بلکہ غیر اسلامی نظاموں کے علمبردار اپنے ماضی کو کراہیت سے دیکھتے ہیں اور اپنی سابق کارگزاریوں کے لئے معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لئے ان کا ماضی قابلِ فخر اور زندگی بخش رہا ہے اور وہ اسی ماضی کے احیاء کو مستقبل کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ پسند کرتے رہے ہیں۔ دورِ حق "تیس سال" تک محدود سہی لیکن بہرحال وہ ایسا مقدس دور ہے کہ اس میں کسی کو کوئی شرمناک چیز نہیں ملتی، اس دور کے کسی واقعہ پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور ہم اس دور کے واقعات کو نہ تو "سبق آموز غلطیاں" قرار دیتے ہیں، نہ ان غلطیوں سے بچ نکلنے کا نام ترقی رکھتے ہیں۔

جمہوری ممالک میں نظامِ زندگی متغیر ہے، لیکن لوگ اسے ترقی قرار دیتے ہیں اور پچھلے طریقوں کو نادانی کے تجربات سمجھتے ہیں۔ "حاضر" کو بدلنے کی سعی تو ہوتی ہے لیکن "سابق" کے احیاء کے لئے جدوجہد کرنے کی رجعت پسندانہ حرکت کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خود کمیونزم کے نظام میں اُس سے بہت بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی چلی آ رہی ہیں جیسی تبدیلی اسلامی نظام میں امیر معاویہ کے دور میں واقع ہوئی تھی۔ بلاتشبیہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی کا اختلاف اُس اختلاف سے کم زوردار نہ تھا جو اسلامی تاریخ میں امیر معاویہ کے طرزِ عمل سے امام حسین کو ہوا تھا جس طرح ہمارے ہاں تاریخ کی رو امام حسین کو شہید کرتی ہوئی آگے نکل گئی، اسی طرح روس میں اشتراکی تاریخ کی موجوں نے ٹراٹسکی کو اٹھا کے ایک خزف ریزے کی طرح پرے پھینک دیا۔ وہاں بھی نظام میں اصولاً تغیر آ گیا تھا، اور یہاں بھی آیا، لیکن دونوں طرف ایک جیسے واقعات کے لئے احساسات

مختلف ہیں۔ واقعہ کربلا کے ظہور پر ہماری تاریخ نے جو موڑ مڑا تھا ہم اس کو غلط کہتے ہیں لیکن روسی تاریخ نے جو موڑ مڑا تھا اس تاریخ کے بنانے والے اُس کو ترقی کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ورنہ اگر اصل واقعات کو دیکھا جائے تو لینن جس نظام کو قائم کرنے چلا تھا اسے قائم کرتے ہوئے اسے متعدد اصولوں کو بدلنا پڑا، اور پھر اسٹالین نے اسے اور مسخ کر دیا۔ لینن نے کولکس کی بغاوت کا سامنا کرتے ہوئے ایک نئی زرعی پالیسی اختیار کی، پھر انٹرنیشنلزم سے نیشنلزم کی طرف ساری پالیسی کو پسپا ہونا پڑا، پھر مذہب دشمنی میں نرمی پیدا کرنی پڑی، پھر انفرادی املاک کے بارے میں ابتدائی اصولوں میں خاصی تحریف کی گئی، پھر مغربی امپیریلزم کے جواب میں امپیریلزم کے کٹر دشمن بن کے اٹھنے والوں کو خود امپیریلزم کا علم اٹھانا پڑا۔ یہ ساری "بدعات" واقع ہوئیں لیکن یہ ترقی کی شاہراہ کے لئے سنگِ میل قرار پائیں۔

بخلاف اس کے اسلام کے معیاری نظام میں اس طرح کی جو تبدیلیاں کی گئیں، ان کے خلاف مسلمانوں میں نفرت نمودار ہوتی رہی، صلحاء ان کے خلاف ذہنوں کو تیار کرتے رہے، اُن پر بندگانِ حق نے احتجاج کرنے کا حق ادا کیا، اور جہاں کسی اصلاح پسند کو موقع ملا، اس نے اصل معیاری نظام کے اصولوں کو از سرِ نو برپا کرنے کی جدوجہد کی۔ ایسی جدوجہد کی بہت سی مثالیں علمی و فکری تاریخ میں بھی موجود ہیں اور سیاسی تاریخ میں بھی۔ معیاری نظام کے احیاء کی کامیاب ترین مثال حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں ملتی ہے، لیکن آپ کے علاوہ بہت سے ایسے اکابر کے کارنامے بھی ناقابلِ فراموش ہیں جو اگر کُل کے کُل نظام کا احیاء نہ کر سکے تو کم سے کم اس کے جن اجزا کی تجدید کرنا ان کے بس میں تھا، ان کو انھوں نے دوبارہ قائم کیا۔ تجدید و احیاء کی یہ اسپرٹ ملتِ اسلامیہ میں بدستور کام کر رہی ہے اور اسی اسپرٹ کے زندہ ہونے کی وجہ سے ہم نظامِ اسلامی کی قدروں سے وابستہ ہیں اور ان کو زندگی میں عملاً کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔

ششم:۔

ایک پاکباز سوسائٹی، ایک صالح نظامِ حکومت اور ایک بااخلاق تہذیب و معاشرت اگر چند روز کے لئے بھی صفحۂ ہستی پر جلوہ افروز ہو تو وہ اپنے مٹ جانے سے پہلے انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈال جاتی ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آج اگر پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو ——— اور بالفرض وہ تیس ہی سال

چل کر ختم ہو جائے ـــــــ تو بس وہ ایک حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی اور تاریخِ انسانی اور انسانیت کے نوعی ذہن و اخلاق پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو پھر آپ تمدنِ انسانی کے نوامیس سے قطع نظر کر کے سوچتے ہیں۔ دن چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو جائے، اور چھوٹے سے چھوٹے دن کو آفتاب کے سامنے کتنے ہی لکہ ہائے ابر چھائے رہیں، لیکن سورج کے طلوع کے چند فطری اثرات جمادات، نباتات اور حیوانات پر لازماً پڑتے ہیں، یہاں تک کہ بعد میں لمبی رات کی تاریکی اور ٹھنڈک بھی اگر آکے مسلط ہوتی ہے تو بھی وہ دنیا سے سورج کے طبعی اثرات کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح نظامِ حق کا ظہور چاہے کتنے ہی قلیل وقت کے لئے ہو، اور بعض وجوہ سے چاہے وہ ناقص ہی کیوں نہ رہ جائے، پھر بھی اس کے اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں ـــــــ اور ان اثرات کو بعد میں تسلط باطل بھی پوری طرح ملیامیٹ نہیں کر سکتا۔

آپ نیکی اور حق کے اجتماعی نظام کو الگ رکھ کر حق اور نیکی کے سپاہیوں کے انفرادی کارناموں پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ فرزندانِ انسانیت کے اچھے کارنامے ہی وہ نور ہیں جن سے ہمارا ایوانِ تاریخ روشن ہے۔ انہی کارناموں کے چراغ جلا کر ہم عظیم الشان مہموں کو سر کرنے کے لئے نکلتے ہیں، انہی کارناموں سے ہمارے ادبیات کی رگوں میں گرم گرم جذبات کا خون رواں دواں ہے، انہی کارناموں سے ہمارے افکار غذا حاصل کرتے ہیں، انہی سے ہماری انقلابی تحریکیں سرگرمی اخذ کرتی ہیں اور انہی سے ہم آج بھی خیر کا سبق لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے زریں کارناموں کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ کیا ان بہی خواہانِ انسانیت کی خدمات حق نسیاً منسیا ہو گئی ہیں اور تاریخ پر ان کا کوئی اثر باقی نہیں ہے؟ ـــــــ ایسا نہیں ہے۔ حق اور نیکی کی راہ میں جینا تو جینا ہے، اس راہ میں مرنا عالمِ انسانی کے لئے ہزار در ہزار زندگیاں پیشکش کرتا ہے۔ جس پاکیزہ مقصد کے لئے ایک مرتبہ کوئی انسانی جان بھینٹ چڑھتی ہے، اس کی قیمت پہلے سے بڑھ جاتی ہے، اور اس کے فداکاری دکھلانے والے عشاق پہلے سے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ میدان میں آنے لگتے ہیں۔ ایک وقت میں نیکی کے لئے قربانی کا جو بیج بویا جاتا ہے، وہ پھر بار بار پھوٹتا رہتا ہے۔ ہر انسانی ایثار جو حق کے لئے خاص ہو، ایک ایسا ققنس ہوتا ہے جو بار بار اپنی راکھ سے پیدا ہوتا رہتا ہے اور اپنے نغمۂ آتشیں سے فضا کو گرم کرتا رہتا ہے۔

جب انفرادی کارناموں کا اثرات اتنا دور رس ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظام حق کے ظہور کا اثر کہاں تک پہنچا ہوگا۔ چنانچہ عرب میں جو اسلامی نظام تہذیب و سیاست برپا ہوا تھا، اس نے اپنے حلقۂ اثر میں آنے والوں پر بعض ایسے فکری و اخلاقی اثرات ڈالے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ آج تک کسی نہ کسی درجے میں برقرار ہیں۔ دوسری طرف اس نے اپنے مخالفین تک کے تہذیب و تمدن کا رخ بدل کے رکھ دیا۔ جن لوگوں کو علم و تحقیق سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ مغرب میں نشأۃ ثانیہ (RENAISSANCE.) کا ظہور جس نے فکری آزادی کے دور کا یورپ میں افتتاح کیا براہِ راست اسلام کے اثرات کا ردِّ عمل تھا۔ اسی طرح مغربی اقوام کو فکری اور طبعی علوم کے خزانوں کی ساری کنجیاں بھی ان عربوں سے ہاتھ آئیں جو اسلام کے علمبردار تھے۔ پھر مغرب کی سیاسی فکر کے ارتقا پر اور اس کے تاریخی پس منظر پر اگر آپ گہری نگاہ ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ جمہوری نظام سیاست بھی ملّتِ اسلامیہ کی مخصوص فکر کا ایک بالواسطہ نتیجہ ہے۔ افلاطون کی نظری جمہوریت درحقیقت مغربی جمہوریت کو ظہور میں لانے کی محرک نہیں ہوئی بلکہ جمہوریت کی عملی روح یورپ نے عربوں سے لی اور اسے مادہ پرستی کے قالب میں لاکر بر سر عمل کیا۔ یہ اخوت اور مساوات اور عدل وغیرہ کے جو تصورات موجودہ دور میں ابھر رہے ہیں، یہ دراصل اسلام ہی کے فکری عطیات کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اسی طرح مغربی فلسفہ جو بدقسمتی سے خدا پرستی کے بجائے الحاد کی راہ پر چل نکلا اس کے اندر اسلامی فلسفہ کے بے شمار افکار گندھے ہوئے ہیں، اور آج غلط افکار سے ترکیب پاکر وہ اتنے مسخ ہو گئے ہیں کہ ان کو پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قانون اور بین الاقوامی مسائل میں جدید دنیا نے اسلام سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ یہی حال ادبیات کا ہے۔

اگر اسلامی نظام تیس سال کے لئے برپا نہ ہوا ہوتا تو پھر اس کے یہ سارے نتائج کہاں سے آتے؟ پھر تو دنیا کا نقشہ دوسرا ہوتا۔ فلسفہ، سیاست، قانون، بین الاقوامیات اور مختلف علوم و ادبیات کا طرز نشو و نما کوئی اور ہوتا۔

پس "محض تیس سال" کہہ کر نظام حق کی قدر و قیمت گرا کر دکھانے کی جو کوشش کی جاتی ہے، وہ نہایت درجہ لغو کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام حق اگر ایک دن کے لئے بھی بپا ہو سکے ------ اور پورا نہیں، آدھا پونا ہی بپا ہو سکے تو بھی آئندہ چند صدیوں کے لئے دنیا کے علم پر، دنیا کی سیاست پر، دنیا کے ادب پر،

دنیا کے قانون پر ایسے مفید اثرات چھوڑ جائے گا کہ ان اثرات کے پیش نظر اسے ایک دن کے لئے برپا کرنے میں اگر ہزاروں جانیں صرف ہو جائیں تو بھی سودا مہنگا نہیں۔ انسانیت کے لئے بجائے خود یہ چیز بہت بڑے درجے کا احسان ہے کہ اس کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نقشہ عملاً پیش کر دیا جائے اور اگر یہ نقشہ زیادہ دیر کے لئے قائم نہ رکھا جاسکے تو اس کی ایک جھلک دکھا دینا بھی انتہائی خیر کا وسیلہ ہو سکتا ہے۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ ادب میں خیالی نقشے (UTOPIA) پیش کر کر کے انسان کو فکری و اخلاقی ارتقا کے لئے مصنوعی طور پر تحریک دلائی جاتی ہے، لیکن اگر خیالی نقشوں کو پیش کرنے کے بجائے ایسا ہو کہ ایک واقعی منظر ساری دنیا کو دکھایا جاسکے تو وہ ارتقا کی تحریک دلانے میں کتنا مؤثر ہو سکتا ہے۔

وہ نظام حق جس کی تحقیر کرنے کے لئے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ "صرف تیس سال" چلا تھا، کبھی انھوں نے ٹھنڈے دل سے اس کی نوعیت اور اس کے معیار پر بھی غور کیا ہے؟ اس نظام نے ہر لحاظ سے جو حیرت انگیز معجزے دکھائے ہیں، کیا کبھی اس کا مذاق اڑانے والوں نے ان معجزوں کی لاثانیت کا بھی اندازہ کیا؟

یہ ایسا نظام تھا:۔

جو ایک غیر خونی انقلاب کے ذریعے برپا ہوا۔ پورے عرب میں اس کے قیام کے لئے چند ہزار سے زیادہ جانیں صرف نہیں ہوئیں۔

جو سی، آئی، ڈی قانونی تحکم، تشدد اور سازش کاریوں کے بغیر چلا ہے۔

جس نے بے شمار انسانوں کی زندگیوں کا پورا نقشہ یکسر پلٹ کے دکھا دیا، ان کو جاہل سے عالم بلکہ معلم، ان کو بے اخلاق سے با اخلاق بلکہ نگرانِ اخلاق، ان کو فتنہ انگیزوں سے امن پسند بلکہ نگہبانِ امن اور ان کو بے نظم سے منظم بلکہ ماہرینِ تنظیم بنا دیا۔

جس کے تحت جرائم کا اوسط اتنا کم رہا ہے کہ آج کی مہذب کہلانے والی اقوام میں سے کوئی اپنے جرائم کی تعداد اتنی گھٹا نہیں سکی۔

جس کی عدالتوں میں گنتی کے مقدمات پیش ہوئے۔

جس کے حکمرانوں کا معیارِ زندگی ہر لحاظ سے عوام کے برابر رہا۔

جس کے علمبرداروں نے قلتِ تعداد اور بے سرو سامانی میں بھی بڑی سے بڑی طاقتوں سے ٹکرا کے ان کا زور توڑ کر رکھ دیا۔

جس کی فوجوں نے میدانِ جنگ میں شریف اخلاق کا مظاہرہ کیا اور اپنے دشمنوں پر بھی احسانات کئے۔

جس نے عوام کی فلاح و بہبود کا پورا پورا حق ادا کیا۔

جس نے اپنے اصولوں کے بارے میں کبھی سودا بازی (COMPROMISE) کی روش اختیار نہیں کی۔

جس نے جماعت کی فکری وحدت کو ایسی مستحکم بنیادوں پر اٹھایا کہ نہ کوئی عصبیت اسے توڑ سکی، نہ سیاسی تفرقہ نمودار ہوا۔

جس کے خلاف نیچے سے کوئی ردِ عملی (RE-ACTIONARY) انقلابی تحریک نہیں برپا ہوئی۔

اور — جس میں روزمرہ کی زندگی اعلیٰ انسانی اخلاق کے مظاہر سے لبریز تھی، اور گھٹیا اخلاق کے نمونے ناپید تھے۔

یہ معیاری نظام جس کی کوئی مثال کسی غیر اسلامی فکر کے علمبرداروں کی طرف سے آج تک سامنے نہیں آسکی، اگر تیس سال تک چلا تو آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ نوعِ انسانی کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نمونہ اتنی دیر تک رکھا گیا کہ وہ اسے ہر پہلو سے خوب اچھی طرح دیکھ لے، اور پھر اس کی نقل اتارنے کے لئے جدوجہد کرتی رہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی خیالی نقشہ (UTOPIA) ہمارے سامنے ہو، آج ماضی ایک "امرِ واقعہ" کو ہمارے سامنے لئے کھڑا ہے اور ہم ایک روشن مستقبل کی تعمیر اسے سامنے رکھ کے کر سکتے ہیں۔

بالفرض اگر دوبارہ یہی صورت پیش آئے کہ اس طرح کا صالح نظام صرف تیس ہی سال کے لئے رونما ہو تو اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ انسانیت کی فلاح کی منزل آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں تازہ ہو جائے گی۔ ایک لمبی رات سے پہلے اگر ایک چھوٹا دن بھی دنیا کو نصیب ہو جائے تو آفتابِ حق کے طلوع کی برکات دن گزر جانے کے بعد بھی برابر محسوس کی جا سکیں گی۔

صحیح نقطہ نظر

ان تصریحات کو ایک طرف رکھ کر خوب سوچیئے کہ کسی اصول و نظام کے قبول یا رد کرنے کے بارے میں ایک سلیم الطبع آدمی کا طرزِ فکر کیا ہونا چاہیئے!

آپ صفائی کے اصول کو ہر لحاظ سے پرکھ کر حق پاتے ہیں، لیکن فرض کیجئے کہ آپ ایک ایسے ماحول میں رہتے

ہیں جو سخت گندہ ماحول ہے۔ آپ کی سوسائٹی کا ہر شخص گندگی پھیلانے میں سرگرم ہے اور سوسائٹی ایک نظام غلاظت چلا رہی ہے۔ فرض کیجئے آپ اپنے ماحول کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول پر آج سے پچاس سال پہلے صرف ایک ہفتہ ایسا آیا تھا جبکہ یہاں ہر طرف صفائی ستھرائی تھی، ہوا میں تعفن نہ تھا، کریہہ مناظر نہ تھے، بیماریاں نہ تھیں، بلکہ پاکیزگی کا دور دورہ تھا، لیکن یہ حالت تھوڑے دنوں رہ کر ختم ہوگئی اور پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ یا آپ کو تاریخ میں ایک دن بھی ایسا نہیں ملتا۔ اب آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟

کیا محض اس وجہ سے کہ سابق تاریخ میں صفائی کا دور بڑا مختصر سا گزرا تھا، یا سرے سے کوئی دور ایسا آیا ہی نہ تھا، اور چونکہ آج تمام لوگ غلاظت پسند ہیں اور بظاہر پائداری نظام غلاظت ہی میں محسوس ہوتی ہے، آپ اپنے بارے میں یہ فیصلہ کریں گے کہ آپ کو بھی غلاظت پسند اور نظام غلاظت کا سچا خادم بن جانا چاہیے؟ ——— نہیں اگر آپ کے اندر خودی زندہ ہوگی تو آپ یوں سوچیں گے کہ غلاظت بہرحال انسانیت کے لئے غلط اور مضر ہے اور صفائی کا اصول و نظام اس کے لئے برحق اور مفید ہے، اس لئے میرا فرض یہ ہے کہ نظام غلاظت کے خلاف لڑنے اور اصولِ صفائی کو عملاً قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دوں۔ آپ اصول پسندوں کی طرح سوچیں گے کہ اصولِ صفائی کے تحت گزرنے والا ایک ہی دن اگر پوری زندگی کی جدوجہد کے معاوضے میں حاصل ہو تو بھی یہ غلاظت کے نظام کے تحت سو سال جینے سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ بلکہ آپ یہ عزم لے کے اٹھیں گے کہ صفائی کا نظام قائم کرنے کے لئے غلاظت سے لڑتے ہوئے اگر ساری زندگی ختم ہو جائے ——— اور عملاً اس مہم میں ایک منٹ کے لئے بھی کامیابی حاصل نہ ہو تو بھی بااصول آدمی کا طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس ایمان اور اس طرزِ فکر کے ساتھ اٹھتے ہیں، بازی انھی کے ہاتھ رہتی ہے۔

بالکل اسی طرح اسلام کے اصول اور نظام کو معقول طریق سے جانچئے، اس کے برحق ہونے پر غور کیجئے، اس کے افادی نتائج کا اندازہ کیجئے، پھر اگر آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ یہی اصول و نظام حق ہے، یہی مطابقِ فطرت ہے، یہی مفید انسانیت ہے تو اس کے بعد آپ کا طرزِ عمل اس کے سوا کچھ اور رہنا ہی نہ چاہیے کہ آپ اپنی پوری قوتیں اس اصول و نظام کو برپا کرنے کے لئے صرف کر دیں۔ اگر آپ کی کوششوں سے اسلام دوبارہ تیس ہی سال چلے گا تو بھی اس تیس سال کے عرصے میں وہ خیر و برکت کے اتنے تحائف دنیا کو دے کر رخصت ہوگا کہ

اس میں بگاڑ کے دوبارہ آنے میں ایک لمبی مدت صرف ہوگی۔

یہ جو ضرب المثل ہے کہ لومڑی کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی زیادہ اچھی ہوتی ہے، اس کو اگر آپ یوں بدل لیں تو اچھا ہو کہ نظام حق کے تحت ایک دن جینا، نظام باطل کے تحت ہزار سال جینے سے زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ آپ اس سے بھی آگے بڑھیں اور یہ نظریہ سامنے رکھیں کہ غیر اسلامی نظام کے تحت امن چین سے پڑے رہنے سے وہ موت اچھی جو اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں نصیب ہو!

انفرادی ملکیت اسلام میں

نعیم صدیقی

(۳)

اس مضمون کی پہلی قسط کے شائع ہونے کے بعد ایک مقامی روزنامے میں کسی "عالم دین" نے میرے دلائل سے تعرض کیا اور خلافتِ راشدہ کے دور سے دو ایک نظیریں صاحبِ موصوف نے ایسی پیش فرمائی ہیں جن سے بظاہر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت تقسیم اراضی اور زرعی املاک کو سلب کرنے کے غیر محدود اختیارات رکھتی تھی اور اس کا عمل قومی ملکیت کے اصول پر مبنی تھا۔ حالانکہ یہ نظیریں یا تو حکومت کے عطایا (جو اراضی موات اور اراضی خالصہ ہی سے دیئے جاتے ہیں) سے تعلق رکھتی ہیں، یا پھر چشمہ زاروں، جنگلات اور چراگاہوں سے، اور ان کے بارے میں شریعتِ اسلامیہ میں بہت ہی واضح قسم کے مخصوص قوانین موجود ہیں جن کو عام زمینوں پر پھیلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں تحقیق کر کے ضروری مواد بہم پہنچایا اور ایک نئی بحث مرتب بھی کر لی۔ لیکن چونکہ مضمون کی آخری قسط کی کتابت بھی اس دوران میں مکمل ہو چکی تھی، لہٰذا اس بحث کو شامل نہ کیا جا سکا۔ اب انشاء اللہ جب یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہوگا تو یہ بحث بھی اس میں بڑھا دی جائے گی۔

املاک میں خلافتِ راشدہ کے بعض خاص تصرفات

"قومی ملکیت" کو اسلام ثابت کرنے کے لئے خلافتِ راشدہ سے چند ایسے خاص نوعیت کے "نظائر" تحریروں اور تقریروں میں بیان کئے جاتے ہیں جن کی اصل حیثیت کو

نہ بیان کرنے والے سمجھتے ہیں، نہ ان کے سامنے سر دھننے والے! وہ خود بھی مغالطے میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتے ہیں۔

ان خاص نظائر میں سے چند اہم ترین مثالیں یہ ہیں :۔

اول : عیاض بن غنم (عامل مصر) کے متعلق حضرت عمرؓ کو شکایت پہنچی کہ وہ لباس فاخرہ پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان رکھتے ہیں، چنانچہ ان کو پکڑ بلوایا گیا اور سخت تنبیہ کی گئی تا آنکہ وہ معافی مانگ کر منصب پر بحال کئے گئے۔

دوم : حضرت ابو موسیٰ اشعری کے متعلق شکایات موصول ہوئیں کہ ان کی ایک لونڈی کو وہ غذا ملتی ہے جو عام مسلمانوں کو نصیب نہیں، تو ثبوتِ الزام پر لونڈی ان سے الگ کرادی گئی۔

سوم : کوفہ میں سعد بن ابی وقاص نے اپنے لئے ایک عالی شان محل بنوایا جس کے آگے ڈیوڑھی تھی چنانچہ تحقیقات کے بعد محمد بن مسلم کو حکومت نے مامور کیا کہ وہ اس ڈیوڑھی کو آگ لگا دیں۔

چہارم : حضرت خالد بن ولید نے رومیوں کو فتح کر کے بہت سا مالِ غنیمت پایا تو اس میں سے اشعث بن قیس (شاعر) کو دس ہزار روپیہ انعام دیا۔ حضرت عمرؓ نے معاملے کی تحقیق کے بعد خالدؓ کے ذاتی مال میں سے یہ روپیہ ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان واقعات کو تاریخ کے اوراق میں پا کر مارکسیت کے علمبرداروں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور فرطِ مسرت میں وہ ان کی خاص نوعیت کا جائزہ بھی نہیں لے پاتے بلکہ فوراً زبان و قلم سے یہ طوفان اٹھا دیتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ میں انفرادی ملک کو قومی مفاد پر قربان کرنے کا طریقہ عام طور پر رائج رہا ہے۔

یہ سب کچھ سطحی معلومات کا کرشمہ ہے!

یہ سارے واقعاتی نظائر دراصل اسلامی حکومت کے افسروں اور ملازموں سے متعلق ہیں۔ ان افسروں اور ملازموں کے معاملات کو اسلامی حکومت کے "ضابطۂ خدماتِ عامہ" (PUBLIC SERVICE CODE) اور قواعدِ ملازمت (SERVICE CONDUCT RULES) کے تحت دیکھا جاتا تھا۔ ان ضوابط و قواعد کی رو سے اسلامی حکومت کے افسروں اور ملازمین کی پوری زندگی (سرکاری اور نجی) پر نگرانی قائم رکھی جاتی تھی، اور اس کا لحاظ کیا جاتا تھا کہ

جن شرائط پر ان سے معاملہ طے ہوا تھا وہ ان کو پورا کرتے ہیں یا نہیں ؟

ان ضوابط و قواعد کی رو سے خلافتِ راشدہ کا ہر سرکاری کارکن اس بات کا پابند تھا کہ وہ سادہ زندگی بسر کرے گا، ٹھاٹھ باٹھ کے مظاہرے سے پرہیز رکھے گا، عام لوگوں سے ربط رکھے گا اور ان کو شکایات و مطالبات پیش کرنے کے لئے پوری سہولتیں دے گا، نیز نہ ریاست کے اموال کو بے جا طور پر صرف کرے گا اور نہ ذاتی اموال سے سوسائٹی میں ایسے نمونے قائم کرے گا، جن سے پوری پبلک میں مفاسد پھیل سکتے ہوں۔

مندرجہ بالا واقعات میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ اس قسم کی حدود و شرائط میں سے کوئی نہ کوئی ٹوٹتی تھی اسی کو قائم کرنے کے لئے متعلقہ کارکنوں کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی گئی۔

یہ واقعات اگر عام شہریوں کے متعلق ہوتے اور کسی عدالتی قانون اور عدالتی کارروائی یا کم سے کم انتظامیہ (EXECUTIVE) کی طرف سے ان کی املاک میں تصرفات کئے گئے ہوتے تو پھر معاملہ قابلِ غور تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ حکومت کے افسران اور ملازمین پر جو خاص پابندیاں عائد تھیں (اور دُنیا کی ہر حکومت اپنے کارکنوں پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے) ان سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ شہریوں کے عام بنیادی حقوق تک میں قطع و برید کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے الٹے سیدھے استدلال کر کے جو لوگ اپنی اسلامیت کا رعب گانٹھنا چاہتے ہیں، حقیقت حال پر نگاہ ڈالتے ہی ان کی جہالت کا سارا راز فاش ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (جن کی حکومت خلافتِ راشدہ ہی کا ضمیمہ قرار پاتی ہے) نے شاہی خاندان کے افراد اور دوسرے درباریوں اور امراء سے بھی آخر جاگیریں سلب کی ہی تھیں، حالانکہ وہ ان کی ذاتی مِلک بنا دی گئی تھیں، تو پھر اسی طرح آج کوئی حاکمِ عادل اٹھے اور وہ لوگوں کے املاک کو ان کے قبضے سے نکال لے تو ایسا کرنا ناجائز کیوں ہونے لگا ؟

یہاں پھر ایک نظیر کی نوعیت سمجھے بغیر فتویٰ دیا جا رہا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دراصل جو اصلاحی مہم شروع کی تھی وہ اموالِ مغصوبہ کی واپسی کی مہم تھی۔ آپ نے ایک طرف بیت المال کو وہ املاک (زمینیں، سازو سامان، نقدی، جواہرات وغیرہ) واپس دلوائیں جو ناجائز مقاصد کے لئے، ناجائز مقداروں میں ناجائز طریقوں سے دی اور دلوائی گئی تھیں، اور دوسری طرف عام شہریوں

(مسلمانوں اور ذمیوں، دونوں) کو ان کی املاک (زمینیں، سازوسامان وغیرہ) ان لوگوں کے قبضے سے نکال کر واپس کرائیں جن کو سابق حکومت نے جبراً سلب کر کے بہم پہنچائی تھیں۔

یہ دو مختلف قسم کے اموال تھے۔ ایک حکومت کے املاک جو ناجائز طور پر کسی کے شخصی قبضے میں دیئے گئے تھے اور دوسرے شہریوں کے املاک جو حکومت نے دوسرے شہریوں کو جبراً دلوا دیئے تھے۔ یہ سب کے سب بیت المال میں داخل کر کے قومی ملکیت نہیں بنا دیئے گئے تھے، بلکہ جو جس چیز کا حقدار تھا وہ اسی کو دلوائی گئی تھی۔

پھر یہ ساری اصلاحی مہم باضابطہ آئینی کارروائی کر کے سرانجام دی گئی تھی اور ایک ایک معاملے پر الگ الگ غور کیا گیا تھا۔

اس نظریئے سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر ایک حکومت نے پبلک خزانے کے املاک کو ناجائز طور پر افراد کے حوالے کر دیا ہو، یا بعض افراد سے چھین کر کوئی مال بعض افراد کو بلا کسی قانونی حق کے دلوا دیا ہو تو بعد کی صالح حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر معاملے کی تحقیق کر کے حقداروں کو ان کا حق پہنچا دے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلا کہ افراد سے جو کچھ چاہو چھین کر اسے قومی ملکیت کے باڑے میں داخل کر دو!

یہیں وہ نظائر جن سے عام طور پر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس کی حقیقت پر ذرا سا غور کرتے ہی اس استدلال کی قلعی کھل جاتی ہے جس پر قومی ملکیت کے "اسلامی" فلسفے کا دارومدار ہے!

سرمایہ داری اور اسلام کے نظامِ ملکیت میں فرق

جب ہر طرف سے قومی ملکیت کے مسلم مبلغوں کو دلائل گھیر کر یہاں لے آتے ہیں کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا حق شہریوں کے بنیادی حقوق میں داخل ہے اور یہاں نہ قومی ملکیت کے اصول کی ضرورت ہے، نہ اس کی جگہ ہے، تو پھر اس طنز پر بات ختم کر دی جاتی ہے کہ اگر بات یہی ہے تو اسلام اور سرمایہ داری میں فرق کیا رہا!

یہ درست ہے کہ انفرادی ملکیت کا اصول اسلام میں بھی پایا جاتا ہے اور سرمایہ داری میں بھی لیکن کیا اتنی سی بات سے دونوں ایک ہو جائیں گے؟ اگر ایسا ہے تو کمیونزم بھی "اصولی ریاست" کا داعی ہے اور اسلام بھی! پھر کیا اسلام اور کمیونزم ایک ہو جائیں گے؟ بکری کا بھی معدہ ہوتا ہے اور اونٹ کا بھی، تو کیا

ان کو ایک سمجھا جائے گا؟ ہرن کے بھی سینگ ہوتے ہیں اور نیل گائے کے بھی، تو کیا اتنی سی بات دونوں کو ایک بنا دے گی؟ کچھ سوچیئے کہ آپ حضرات کی منطق کی چولیں کہیں سے ڈھیلی تو نہیں ہیں!

آیئے، اب آپ کی خدمت میں تجزیہ کر کے واضح کیا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام ملکیت اور سرمایہ داری کے نظام ملکیت کو کونسی چیزیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) املاک کے حصول، تقسیم، اور ان کے استعمال کے بارے میں اسلام کے چند بنیادی اصول (FUNDAMENTALS) اور چند قانونی حدود (LIMITATION) کتاب وسنت کی رو سے ہر ملک اور زمانے کے لئے واجب القبول ہیں اور ان کو بدلنے یا برطرف کرنے کا حق دستور و قانون کے لحاظ سے کسی کو حاصل نہیں ہے یہ بنیادی اصول وحدود دراصل ان بے شمار مفاسد کا دروازہ بند کرنے کے لئے ہیں جنھیں اگر کھلا چھوڑ دیا جائے تو پھر انفرادی ملکیت کا نظام انسانیت کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔

مثلاً سود اور سٹے اور قمار کی حرمت، معصیت کو کمائی کا ذریعہ بنانے یا معصیت کے راستوں میں خرچ کرنے کی حرمت۔ یا صدقاتِ واجبہ کی ادائی اور ایک خاص نظم سے وراثت کی تقسیم وغیرہ کا لازم ہونا! ——— وغیرہ۔

بخلاف اس کے سرمایہ دارانہ نظام میں آمد و صرف اور تبادلہ و تقسیم کے لئے کوئی اٹل اصول و قواعد نہیں ہیں کہ ہر حال میں ان کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا بہاؤ کسی ایک متعین رودگاہ میں نہیں ہوتا بلکہ وہ افراط و تفریط کے مظاہرے کرتا ہوا بڑھتا ہے۔ اس کے خداوند آج ایک حد کو قائم کرتے ہیں تو کل اسے خود ہی توڑنے کا فیصلہ کر دیتے ہیں، اور کل جسے توڑا تھا اسے آج پھر بحال کرنے کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں۔

(۲) اسلام کے سارے ضابطۂ ملکیت میں اس سرے سے اس سرے تک افراد اور معاشرہ کے اخلاقی ارتقا کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور اصول وحدود محض معاشی فائدوں اور نقصانوں کا جائزہ لے کر نہیں مقرر کئے گئے، بلکہ اس سے زیادہ انسانیت کے اخلاقی نفع و نقصان کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مثلاً سود بعض معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے میں خاصا مفید معلوم ہوتا ہے، اور اس کے بعض فوائد

کے پیشِ نظر سرمایہ دارانہ نظام نے اسے قبول کیا ہے اور اس کو اصول بنا کر اس پر بنکنگ کا لمبا چوڑا نظام تعمیر کر ڈالا ہے جسے دیکھ کر آج مسلمان علماء کی آنکھیں بھی مرعوب ہو جاتی ہیں لیکن اسلام نے سود کے معاشی مفاد کے ساتھ اس کے معاشی نقصانات کو بھی دیکھا ہے، اور ان سے بھی بڑھ کر اس کے اخلاقی مفاسد کا لحاظ کیا ہے۔ اسی طرح شراب کی حرمت معاشی لحاظ سے نہیں، اخلاقی نقطۂ نظر سے عائد کی گئی ہے، حالانکہ معاشی لحاظ سے شراب بنا بنا کر غیر ملکوں کے ہاتھ بیچنا بہت نفع دے سکتا ہے۔

اسلام کے اس مزاج کے پیشِ نظر ایک صحیح اسلامی حکومت اپنی مختلف پہلوؤں کے ساتھ معاشیات میں بھی اپنی قانون سازی اور اپنی پالیسی بنانے کی سرگرمیوں میں مجبور ہے کہ صرف معاشی فائدے ہی کو نہ دیکھے، بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کے ساتھ عوام کے اخلاقی صلاح و فساد کا لحاظ کرے۔ اگر ایک طریقے سے مالی فائدہ ہوتا ہو لیکن اخلاقی نقصان بھی ساتھ آتا ہو تو وہ اسے چھوڑ دے گی اور دوسرے طریقے سے اگر وہ دیکھے گی کہ ایک مالی فائدہ ہاتھ سے جاتا ہے لیکن ملت کو عظیم الشان اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں، تو وہ اخلاقی فوائد کی طرف زیادہ مائل ہو گی۔

ایسے نظام میں جس میں انفرادیت ملکیت ایسی قانونی اور انتظامی تدابیر کے ساتھ قائم کی گئی ہو جو اس کے اندر اخلاقی روح کو بیدار رکھیں اور معاشرت میں اسے مفاسد پیدا کرنے کا موقع نہ دیں، سرمایہ داری سے بالکل مختلف نوعیت کا ہو گا۔

سرمایہ دارانہ ریاست میں تو انفرادی ملکیت کے نظام کو ایسے قانون اور ایسی پالیسی کے ذریعے قائم رکھا جاتا ہے جس میں انسانیت کی اخلاقی فلاح کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ قابلِ لحاظ صرف مادی مفاد، مالی ترقی، ذرائع پیداوار کی افزائش وغیرہ قسم کے مقاصد ہوتے ہیں۔ اخلاق صرف وہی قبول کیا جاتا ہے اور اسی حد تک جس کا یہ مقاصد تقاضا کریں، ورنہ تعمیرِ اخلاق کی بجائے خود کوئی مقصدی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

اب جب "انفرادی ملکیت" کو ایک غیر اخلاقی فضا مل جاتی ہے تو وہ خوب پاؤں پھیلاتی ہے۔ اسے اخلاق کا کوئی سنتری کسی طرف بڑھنے سے نہیں روکتا، اسے کسی چوراہے پر ٹریفک کو کنٹرول کرنے والا کوئی

اصول نہیں ٹوٹتا۔ پس اصل فساد مادہ پرستانہ فضا کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے ——

اور اسلام میں اس طرح کی فضا قابلِ برداشت نہیں ہے۔ اس فضا کو بھی اگر انفرادی ملکیت کے ساتھ اسلام میں اٹھا لایا جائے تو پھر وہ بھی یقیناً سرمایہ داری بن جائے گا۔

سرمایہ دارانہ نظام ایسی خدا پرستانہ ذہنیت اور خدمت پسند سیرت انسانوں کے اندر تعمیر کرنے کی بھاری ذمے داری اپنے سر نہیں لیتا جو ان کو جانور اور درندے بننے سے بچائے۔ اس قسم کا کوئی پروگرام اس کے پاس نہیں ہے، بلکہ اپنی اس کوتاہی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے ارتقاء کا وہ فلسفہ قبول کیا ہے جو طاقت کو حق قرار دے کر اور اخلاق کا محور فائدے کو مقرر کر کے انتہائی فاسد ذہنیتیں اور سیرتیں بہم پہنچا رہا ہے۔

دوسری طرف اسلام حکومت پر واجب ٹھیراتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی اور آخرت کی جوابدہی کے عقائد کا گہرا نقش عوام میں بٹھائے، ان کو اخلاق پرور عبادات کا پابند بنائے، ان میں بھلائیوں میں تعاون اور برائیوں کی مدافعت کا جذبہ ابھارے، ان میں اخوت اور مساوات کی حس بیدار کرے، ان میں ایک صالح جماعتی نظم کو ترقی پذیر بنائے، ان میں باہمی تعاون کی روح پھونکے، ان میں پوری نوع انسانی کو حق کی تعلیم دینے، مفاسد سے بچانے، اور مظالم سے نجات دلانے کو ایک اعلیٰ نصب العین بنا کر ساری قوتیں اس پر صرف کرنے کا جذبہ ابھارے۔

اس طرح سے تیار کی ہوئی سوسائٹی میں انفرادی ملکیت جب پرورش پاتی ہے تو وہ بالکل دوسری ہی قسم کے برگ و بار لاتی ہے۔ پھر اس میں پھل پھول تو نکلتے ہیں کانٹے نہیں نکلتے۔

(۳) سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی ملکیت کے تحت مادہ پرستانہ ذہنیتیں جب طبقاتی کشمکش کی بنا ڈالتی ہیں تو اسٹیٹ اس کشمکش میں بڑی حد تک غیر جانبدار رہتی ہے اور اسے روکنے یا صحیح راستے پر ڈالنے اور کسی نتیجہ خیز پہنچانے کے لئے کوئی پارٹ ادا نہیں کرتی۔ ظالم و مظلوم میں تعاون پیدا کرنے کی کوئی تدابیر اس کے پاس نہیں ہوتیں۔

وہ اگر اس کشمکش میں مداخلت کرتی بھی ہے تو سرمایہ دار طبقہ کے سیاسی تسلط کی وجہ سے ہمیشہ اپنا وزن ظالم عناصر کے پلڑے میں ڈالتی ہے، اور مظلوموں کا کوئی حق وہ اسی وقت مانتی ہے جب اسے یہ محسوس ہو جائے کہ اس کے سوا چارہ کار کوئی اور ہے ہی نہیں۔

بخلاف اس کے اسلام کے نظام میں، اول تو انفرادی ملکیت طبقاتی کشمکش برپا کرنے کے لئے کبھی سازگار حالات نہیں پا سکتی، اور اگر ایسا ہو جائے تو حکومت کی پوری کوشش یہ ہو گی کہ وہ کشمکش کو تعاون سے بدلے۔ اس کے لئے جہاں غیر جانبدار تماشائی بن کر پڑے رہنا ایسی حالت میں ممکن نہیں ہو سکتا، یہ بھی ناقابلِ تصور ہے کہ وہ اپنا وزن ظالم طبقے کے پلڑے میں ڈالے۔ جیسا کہ خلفائے راشدین نے اپنے خطباتِ خلافت میں اسلامی ریاست کی پالیسی کی توضیح کرتے ہوئے اعلانات کئے تھے اور ان پر عمل کر کے دکھایا تھا۔

(۴) سرمایہ دارانہ نظام میں، انفرادی ملکیت کے کھل کھیلنے کی وجہ سے جب مسابقت میں کمزور افراد ہار کر گر جاتے ہیں تو حکومت کی ذمہ داری ان کو اٹھا کر، سنبھال کر، ہمت بندھا کر ذرائع مہیا کر کے پھر سے دوڑ لگانے کے قابل بنانے کے بارے میں اصولاً کچھ نہیں ہوتی۔ کوئی اگر بے روزگاری میں گھر گیا ہے، کوئی محنت کا معاوضہ نہیں پا سکا ہے، کسی کے ہاں فاقہ ہے، کسی کی بیوی علاج سے محروم ہے، کسی کا بچہ تعلیم حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے تو حکومت اس قسم کے حالات پر اس وقت تک متوجہ نہیں ہوتی جب تک وہ یہ نہ محسوس کر لے کہ ان حالات سے اس کی آمدنی میں فرق آ رہا ہے، یا اس کے لئے لا اینڈ آرڈر کو بحال رکھنا مشکل ہو چلا ہے، یا بین الاقوامی طور پر اس کی رسوائی ہو رہی ہے! اصولاً وہ ان حالات کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں رکھتی۔

بخلاف اس کے اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق ہی میں اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ وہ ان کو کسی حال میں بے سہارا نہ رہنے دے گی۔ وہ اگر بے روزگاری یا فاقہ کشی میں مبتلا ہوں گے تو چاہے وہ کوئی منظم احتجاج نہ کر سکیں اور کوئی جلوس نکال کر شور و غوغا نہ مچا سکیں، اور چاہے وہ نہایت ہی قلیل تعداد میں ہوں اور ان کی کوئی آواز نہ ہو، تو بھی وہ ان کی بنیادی ضروریات بہم پہنچانے اور ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے انتظام کرے گی۔

اس مقصد کے لئے اس کا ایک انتظام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ گرتوں کو سہارا دینے کی عام اسپرٹ شہریوں میں پیدا کرتی اور اسے نشو و نما دیتی، اور اس مقصد کے لئے ان کی تنظیموں، اداروں اور اوقاف کی سرپرستی کرتی ہے، اور دوسری طرف وہ خود اپنے بیت المال اور خود اپنے سرکاری اداروں کی مشینری کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔

یہ اہتمام نظام سرمایہ داری میں نہیں ہوتا۔

مثلاً آج ــــــ نظام سرمایہ داری کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے ساتھ ــــــ جب ایک سرمایہ دار کثیر پیداآوری کے لئے ایک مشین خریدتا ہے تو اس سے بالکل بے پروا ہوتا ہے کہ خود اس کے اپنے ہاں کے کتنے مزدور بے کار ہو جائیں گے یا شہر اور ملک کے دوسرے کتنے مزدوروں پر اثر پڑے گا۔ لیکن ایک صحیح اسلامی نظام اور اسلامی معاشرہ میں اصحاب سرمایہ لوگ اس ناپاک ذہنیت کے مالک نہ ہوں گے کہ دوسرے ہزاروں آدمی تباہ ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں، ہمیں تو اپنے فائدے سے غرض ہے۔ پھر سربراہ حکومت اس طرح کی ذہنیت لے ساتھ نگراں ہوگی جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے (یہ بیان طبری کا ہے) کرایہ کے گھوڑوں کا ایک بڑا اصطبل مدینہ میں قائم کرنے والے ایک کاروباری کو اس شرط پر اس کی اجازت دی تھی کہ ان گھوڑوں کے لئے چارہ مدینہ کی حدود سے باہر سے آئے گا تاکہ یہاں کے مویشیوں کے لئے چارے کی قیمتیں نہ بڑھنے پائیں۔ وہ حکومت مشینی دور کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ہر تبدیلی پر نظر رکھے گی کہ یہ کہاں کہاں اثر ڈالتی ہے اور کتنے آدمیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ پھر وہ ان کو بے روزگاری ــــــ اور مشین کے مقابلے ــــــ کے خطرے سے بچانے کے لئے کوآپریٹیو سسٹم کے تحت ایسی اسکیمیں اختیار کرے گی جن میں اس کے تربیت دیئے ہوئے اہل سرمایہ رضاکارانہ طور پر تعاون کے لئے تیار ہوں گے۔ وہ سرمایہ و محنت کو ایک بڑے اور پاکیزہ نصب العین کے لئے اسی طرح جمع کرتی جائے گی جس طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بھاری اسلحہ والے دستے اور ہلکے اسلحہ والے دستے، اور ہوا باز اور سفینہ بان سب کے سب ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

میرے ایک دوست خوب کہتے ہیں کہ اگر مشینی انقلاب نبی صلعم یا خلافتِ راشدہ کے دور میں عرب سے نمودار ہوا ہوتا تو آج دنیا کے نظام ہائے حیات کی شکل ہی دوسری ہوتی!

(۵) سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی ملکیت کی نشوونما جس قانون اور حکومتی انتظام کے تحت ہوتی ہے اس کی باگ ڈور ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے جو سرمایہ دار طبقے کے نمائندے ہوتے ہیں اس نظام میں "انتخابات" کسی اخلاقی معیار پر نہیں ہوتے بلکہ ان پر "روپے کا زور" پورا پورا تسلط رکھتا ہے لیکن اسلام میں صالحیت و تقویٰ کے معیار قرار پانے اور "امیدواری" کے ممنوع ہونے کی وجہ سے بالکل دوسری

قسم کے لوگ آگے آتے ہیں جو کسی ایک طبقے کے نہیں بلکہ جملہ شہریوں کے، پوری ملت کے، اور خود دینِ حق کے مخلص نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں جو قانون و نظم وجود پاتا ہے وہ انفرادی ملکیت کو اس نہج پر پروان نہیں چڑھاتا جس نہج پر سرمایہ دارانہ نظام میں اس کی نشوونما ہوتی ہے۔

یہ پانچ بنیادی اختلافات ہیں جن کی وجہ سے اسلام اور سرمایہ داری میں انفرادی ملکیت کے اصول پر متفق ہونے کے باوجود مشرق و مغرب کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے مارکسی پروپگنڈے کا یہ کہنا کہ جب اسلام انفرادی ملکیت کا داعی ہے تو اس میں اور سرمایہ داری میں فرق کیا رہا محض مغالطہ انگیزی ہے، اور کچھ نہیں!

یہ چیز دگر ہے، وہ چیز دگر!

ایک اور غلط فہمی اسلام کے نظریۂ ملکیت پر جب کوئی ٹھوس بحث کی جاتی ہے تو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انفرادی ملکیت کے اسلامی اصول کو موجودہ بگڑے ہوئے معاشرہ کے احوال میں رکھ کر ہم نظامِ حاضر کا تحفظ کرنے کے لئے سارا استدلال کر رہے ہیں۔ بسا اوقات جان بوجھ کر ایسا سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔

ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے موجودہ سسٹم کو بجائے اس کے کہ قومی ملکیت کے مارکسی نظام میں ڈھالا جائے، بہ حیثیت مسلم ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے اسلامی معاشرہ کے مخصوص سانچے ڈھالیں اور جہاں ملکیت کا اسلامی ضابطہ اختیار کریں وہاں پورا نظامِ معیشت بھی اسلام کا لیں اور اس کے مزاج کے مطابق اسلام کا سیاسی و معاشرتی نظام بھی اختیار کریں۔ ورنہ اصولِ ملکیت اسلام کا لے کر اگر اسے معیشت، معاشرت اور سیاست کے کسی ایسے نظام میں جڑ جائے جو خود غیر اسلامی ہو تو پھر نظام سرمایہ دارانہ بنے گا، نہ کہ اسلامی۔ ہم دعوت اس کی نہیں دے رہے۔

رسائل و مسائل

سوال :۔

آپ نے میرے مضمون "قرآن میں چور کی سزا" پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس کے لیے شکریہ! اب اسی قسم کا ایک اور مضمون "قرآن میں زنا کی سزا" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ میری استدعا ہے کہ آپ اس پر بھی اظہارِ خیال فرمائیں۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو جناب کی دونوں تنقیدوں کا ایک جا جواب دوں گا۔

یہاں سرسری طور پر اس قدر گزارش کرنا ضروری ہے کہ آپ نے میری اس تشریح کے بارے میں نکتہ چینی نہیں فرمائی کہ قرآن نے جو سزا بیان کی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے، اور کم سے کم سزا جج کی قوتِ تمیزی پر منحصر ہے۔ اور نہ اس بارے میں کچھ فرمایا کہ دنیا میں کسی جرم کی سزا مجرم کو آخرت کی سزا سے محفوظ رکھتی ہے۔

نوٹ :۔ مستفسر کے محولہ بالا مضمون کے چند ضروری اقتباسات
درج ذیل ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں جواب کو دیکھا جاسکے (ادارہ)

ہم اپنے سابقہ مضمون (قرآن میں چور کی سزا) میں بتلا چکے ہیں کہ سارقہ سے مراد سرقہ کے تمام مددگار لوگ ہیں، خواہ وہ مؤنث ہوں یا مذکر اور خود عورت اگر چور ہے تو وہ لفظِ سارق میں بھی داخل ہے اور سارقہ بھی ہے۔ یہاں بھی (آیت الزانیۃ والزانی میں) وہی کیفیت ہے۔ زانیہ میں فعلِ زنا کے تمام مددگار لوگ شامل ہیں، خواہ وہ دلال ہوں، دلالہ ہوں یا پیغام رساں ہوں، یا زانیوں کے لیے آسانیاں فراہم کرنے والے، یا زنا کے مفعول ہوں، وغیرہ وغیرہ ـــــــ "چور کی سزا کو بیان کرتے ہوئے "سارقہ" کو سارق کے بعد لایا گیا تھا، آخر کوئی وجہ ہونی چاہیئے کہ یہاں زانیہ کو زانی سے پہلے لایا گیا۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چوری کے جرم میں بڑا مجرم چور ہوتا ہے اور اس کے مددگار بعد میں، مگر زنا کی صورت میں زنا کے مددگار (یعنی زانیہ) زانی سے مقدم ہیں، کیونکہ ان کی امداد اور رضامندی کے بغیر فعلِ زنا

واقع ہی نہیں ہو سکتا، اس واسطے اسے پہلے لایا گیا" ــــ قرآن نے زنا کی دو سزائیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ زانیوں کو ۱۰۰ کوڑے مارے جائیں اور دوسری یہ کہ ان کا مقاطعہ (بروئے آیت الزانی لا ینکح ...... الخ، ص) کر دیا جائے۔ یعنی ان کو مومنین کی جماعت سے علیحدہ کر کے یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ عقوبہ کیے بغیر مومنین کے اندر نکاح کریں" ــــ "قرآن میں دیگر احکام کی رو سے مومن کا مشرکہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں اور یہاں اس کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشرک اور مشرکہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی مشرکہ وہ عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ کسی دوسرے کو حظ اٹھانے میں شریک کرے اور مشرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کو حظ حاصل کرنے میں شریک کرے" ــــ پس زانیہ اور مشرکہ کے معنی میں فرق ہے۔ مشرکہ شوہردار زانیہ ہے، اور زانیہ وہ مرد یا عورت ہے جو فعلِ زنا میں کسی دوسرے کی مدد کرے، اپنے آپ کو مفعول بنانے سے یا کسی دوسری طرح۔ اسی طرح زانی اور مشرک میں فرق ہے۔ زانی عام ہے، خواہ اس کی بیوی ہو یا نہ ہو، اور مشرک وہ زانی ہے جس کی بیوی ہو" ــــ جو عالم صاحبان ہمارے اس قول کو نہیں مانتے وہ زانی کے لئے صرف ایک ہی سزا تجویز کریں گے، یعنی سَو کوڑے، دوسری سزا مقاطعہ ان کے لئے کوئی سزا نہ ہوگی ــــ ظاہر ہے کہ یہ سَو کوڑے انتہائی سزا ہے۔ ہم نے اپنے مضمون (قرآن میں چور کی سزا) کے اندر لکھا تھا کہ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا انتہائی سزا ہے، کم سے کم سزا جج کی قوتِ تمیزی پر منحصر ہے ــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام کی تعزیرات کی کتاب یعنی قرآن مجید اس قاعدے کے خلاف سب مجرموں کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرے اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے، حالانکہ ہر ایک مجرم کے حالات مختلف ہوتے ہیں جن پر جرم کی شدت اور خفت کا دارومدار ہوتا ہے" ــــ "یہی وجہ ہے کہ خلفائے اربعہ اور خود رسولِ اکرمؐ نے زنا کی انتہائی حالتوں میں سَو کوڑوں کی سزا کو ناکافی[۱] خیال کر کے مجرمین کو رجم کی سزا دی، یعنی فتوائے موت صادر کیا" ــــ "ہمارے

---

[۱] گویا سَو کوڑے کی سزا کا زیادہ سے زیادہ ہونا بھی صحیح نہ رہا۔ اگر قرآن نے زیادہ سے زیادہ سزا بیان کر دی تھی تو پھر کوئی جج اس سے پیچھے تو رہ سکتا تھا لیکن آگے بڑھنے کا مجاز نہ تھا۔ (ن۔ص)

زمانے میں رجم جائز ہے یا نہ؟ کم از کم اتنا تو معلوم ہے کہ قرآن میں رجم کا کوئی ذکر نہیں، اور جب حالت یہ ہے تو اسے کیوں ایک منسوخ التلاوۃ اور قائم الحکم آیت کی بنا پر زیر بحث لایا جاوے" .... "البتہ عقل اس امر سے بغاوت کرتی ہے کہ بیٹی یا بھتیجی کے ساتھ زنا کرنے والے کو زندہ رہنے دیا جائے۔ اس لئے اگر بعض مخصوص حالتوں میں زانی کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کیا جاوے تو اس میں کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا۔ مگر وہ صرف فتوائے موت ہو، فتوائے رجم نہ ہو! کیونکہ رجم آج کل کے تمدن کے خلاف ہے اور کوئی انسانی طبیعت رجم کو گوارا نہیں کر سکتی"............ "اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ زنا اور چوری کے جرموں کی سزا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ چور کو توبہ کرنے کا موقع سزا سے قبل دیا گیا ہے اور زانی کو سزا کے بعد دیا۔ (آیت الا الذین تابوا من بعد ما ظلم .... الخ) یہاں ذالک کا اشارہ سزا کی طرف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زانی کسی صورت میں حد سے بری نہیں ہو سکتا مگر چور توبہ کر کے حد سے بری ہو سکتا ہے، بشرطیکہ قاضی قبول کرے (ماخوذ از پیغام صلح: ۲۲ نومبر ۱۹۵۰ء)

جواب:-

عنایت نامہ مع مضمون "قرآن میں زنا کی سزا" پہنچا۔ آپ کے پہلے مضمون اور اس دوسرے مضمون کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں (اور میرے اس اظہار رائے پر آپ برا نہ مانیں) کہ آپ آیات قرآن کی تاویل و تفسیر اور اسلام شرعیہ کی تشریح میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھتے جو ایک خدا ترس آدمی کو ملحوظ رکھنی چاہیے۔ اگر آپ میری نصیحت مانیں تو میں دو باتیں بطور اصول کے آپ کو بتاؤں۔ ایک یہ کہ آپ بطور خود اپنے نظریات قائم کر کے قرآن و سنت سے ان کے حق میں دلائل ڈھونڈنے کا طریقہ چھوڑ دیں اور اس کے بجائے قرآن و سنت سے جو تعلیم ملے اس کے مطابق نظریات قائم کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ قرآن و سنت سے کسی مسئلے کا استنباط کرتے وقت سلف کے مجتہدین و مفسرین و محدثین کی تشریحات کو سرے سے نظر انداز نہ کر دیا کریں۔ آپ کو اختیار ہے کہ ان میں سے ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے قبول کر لیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کا آپ کے ساتھ رہنا اس سے بہتر ہے کہ آپ ان سب سے الگ اپنا مستقل مذہب بنائیں۔ تفرد صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ آپ قرآن و سنت کے گہرے مطالعے سے اعلیٰ درجے کی محققانہ بصیرت بہم پہنچا چکے ہوں (جس کی علامات آپ کی تحریروں میں مجھے

نظر نہیں آتیں) اور جس مسئلے میں بھی آپ اپنی منفرد رائے ظاہر کریں اس میں آپ کے دلائل نہایت مضبوط ہوں۔ ان دو باتوں کو اگر آپ ملحوظ رکھیں گے تو مجھے امید ہے کہ اُس طرح کی غلطیوں سے محفوظ رہیں گے جو میں نے آپ کے مضامین میں پائی ہیں۔

میرے لئے آپ کے مضامین پر مفصل تنقید کرنا تو مشکل ہے، البتہ جو نمایاں غلطیاں بیک نظر دیکھ سکا ہوں انھیں بیان کئے دیتا ہوں۔

(۱) آپ کا یہ قول ایک حد تک صحیح ہے کہ قرآن میں چوری اور زنا کی جو سزا بیان کی گئی ہے وہ انتہائی سزا ہے، کم سے کم سزا جج کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ لیکن اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اگر اس بات کی تصریح نہ کر دی جائے کہ جب زنا کے لیے وہ شہادت بہم پہنچ جائے جو شرعاً ضروری ہے، اور جب شرعی قواعد کے مطابق چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر چوری اور زنا کی وہی حد جاری کرنی پڑے گی جو قرآن میں مقرر کر دی گئی ہے۔ اس صورت میں حد سے کم سزا دینے کا جج کو اختیار نہیں۔ البتہ کمتر درجہ کی چوریاں کمتر درجہ کی سزاؤں کے قابل ہوں گی، اور ثبوتِ زنا کے بغیر اگر کمتر درجہ کے فواحش شہادت یا قرائن سے ثابت ہوں گے تو ان پر کمتر درجہ کی سزائیں دی جا سکیں گی۔

(۲) آپ نے اپنے اس مضمون میں بھی اپنی سابق غلطی کا اعادہ کیا ہے کہ الزانیہ کے معنی "فعلِ زنا کے مددگار لوگ" بیان کیے ہیں اور اس سے مراد "دلال، دلالہ، پیغام رساں اور زانی و زانیہ کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے والے لیتے ہیں۔ قرآن صریح طور پر اس معنی سے اِبا کرتا ہے۔ جس آیت میں زانی و زانیہ کی سزا بیان کی گئی ہے اس میں الزانی سے پہلے الزانیہ کا ذکر ہے اور پھر دونوں کے لیے ایک ہی سزا مقرر کی گئی ہے کہ فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ (دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) لیکن آپ نے اس پر بھی اپنی رائے کو قرآن کے مطابق بدلنے کے بجائے قرآن کے حکم کو اپنی رائے کے مطابق بدلنے کی کوشش فرمائی۔ یہ بڑی بے احتیاطی ہے جس سے پرہیز واجب تھا۔

(۳) مشرک اور مشرکہ کے جو معنی آپ نے بیان کیے ہیں (یعنی مشرکہ وہ عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ دوسرے کو حظ اٹھانے میں شریک کرے اور مشرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کو حظ

حاصل کرنے میں شریک کرے) یہ بالکل ہی ایک آزادانہ معنی آفرینی ہے جس کے لئے نہ لغت میں کوئی بنیاد پائی جاتی ہے، نہ اصطلاح میں، اور نہ کوئی قرینہ ہی ایسا موجود ہے جس کی بنا پر ایسے دوراز قیاس وگمان معنی لئے جاسکیں۔ آیت الزانی لاینکح الازانیۃ او مشرکۃ ..... الخ میں لاینکح سے مراد لایلیق بہ ان ینکح ہے۔ یعنی زانی ایک ایسا بدکار ہے کہ وہ کسی عفیفہ مومنہ سے نکاح کرنے کے لائق نہیں ہے، اس کے لیے اگر موزوں ہوسکتی ہے تو ایک بدکار یا مشرکہ عورت ہی ہوسکتی ہے، اور زانیہ ایک ایسی فاسقہ وفاجرہ ہے کہ وہ کسی باعصمت مومن کے لئے موزوں نہیں ہے، وہ اگر نکاح کے لائق ہے تو ایک بدکار یا مشرک مرد کے لئے ہوسکتی ہے۔ اس سے مقصود فعل زنا کی قباحت وشناعت واضح کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ صالح اہل ایمان کو معروف بالزنا مردوں اور عورتوں سے مناکحت کے تعلقات نہ قائم کرنے چاہئیں۔

(۴) یہ ایک عجیب بات میں نے دیکھی کہ آپ خود تسلیم فرمارہے ہیں کہ خلفائے اربعہ اور رسول اللہ صلعم نے زنا کی انتہائی حالتوں میں (؟ زانی محصن کی آپ تصریح نہیں کرتے) مجرمین کو رجم کی سزا دی ہے، مگر پھر بھی آپ یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ "رجم آج کل کے تمدن کے خلاف ہے اور کوئی انسانی طبیعت رجم کو گوارا نہیں کرسکتی" میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ان الفاظ پر آپ خود اگر کبھی غور کریں گے تو آپ کو ندامت محسوس ہوگی۔ کیا کوئی "انسانی طبیعت" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ پاکیزہ اور رحیم وشفیق ہوسکتی ہے؟ اور کیا ہم مسلمانوں کے لئے آج کل کا تمدن (ایٹم بم والا تمدن!) کوئی معیار حق ہے؟

یہ چند معروضات میں صرف اس لئے پیش کررہا ہوں کہ آپ نے خود مجھ کو اپنے مضامین پر تنقید کی دعوت دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جب اتنا بڑا دل رکھتے ہیں کہ تنقید کی خود دعوت دیتے ہیں تو آپ ضرور میری ان باتوں کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں گے اور اگر حق معلوم ہوں گی تو قبول کریں گے۔ (ا۔م)

سود اور زمین کے کرائے میں فرق

سوال:

روپے کے سود اور زمین کے کرائے میں کیا فرق ہے؟ خاص کر اس صورت میں جبکہ دونوں

سرمایے کے عناصر ترکیبی (UNITS OF CAPITAL) ہیں۔ مثال کے طور پر یک صد روپیہ پانچ روپے سالانہ کی شرح سود پر لگایا جائے یا ایک بگھہ زمین پانچ روپے سالانہ لگان پر، آخر ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ دونوں حالتوں میں یہ معاملہ مشتبہ ہے کہ فریق ثانی کو نفع ہوگا یا نقصان، سرمایہ کار (LENDER) کو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ صاحبِ زر یا صاحبِ زمین نفع و نقصان سے بالکل بے نیاز رہتا ہے۔

جواب:

زمین کے کرایے کی جو شکل میرے نزدیک جائز ہے اس کی تشریح میں مسئلۂ ملکیتِ زمین میں کر چکا ہوں۔ اسے نگاہ میں رکھ کر سوچیے کہ اس میں اور سود میں کیا فرق ہے۔ کرایہ جن چیزوں کا لیا جاتا ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو کرایہ دار کے استعمال سے کچھ نہ کچھ ٹوٹتی پھوٹتی یا خراب ہوتی ہیں اور جن کا اپنی اصلی حالت میں مالک کو واپس ملنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کلیہ کا اطلاق جس طرح فرنیچر، مکان، موٹر وغیرہ پر ہوتا ہے اسی طرح زمین پر بھی ہوتا ہے خواہ اسے لے کر کوئی شخص بوئے جوتے کوئی اسٹال لگائے، یا کسی اور طریقے سے استعمال کرے لیکن روپیہ تو محض ایک قوتِ خرید کا نام ہے۔ اسے اگر کوئی شخص مستعار لے تو اس کے ٹوٹنے پھوٹنے یا گھسنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرض لینے والا جوں کا توں لوٹا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص غلہ قرض لے تو جتنا غلہ لیا ہے اتنا ہی وہ واپس دے سکتا ہے۔ غلہ کی مقدار جو دراصل قرض لی گئی ہے، کوئی گھسنے یا خراب ہونے والی چیز نہیں ہے۔ (ا۔م)

کیا زکوٰۃ کے نصاب اور شرح کو بدلا جا سکتا ہے؟

سوال:

زکوٰۃ کے متعلق ایک صاحب نے فرمایا کہ شرح میں حالات اور زمانے کی مناسبت سے تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ حضورِ اکرمؐ نے اپنے زمانے کے لحاظ سے ۲½ ٪ شرح مناسب تصور فرمائی تھی، اب اگر اسلامی ریاست چاہے تو حالات کی مناسبت سے اسے گھٹا یا بڑھا سکتی ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ قرآنِ پاک میں زکوٰۃ پر جا بجا گفتگو آتی ہے لیکن شرح کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا، اگر کوئی خاص شرح

لازمی ہوتی تو اسے ضرور بیان کیا جاتا۔ اس کے برعکس میرا دعویٰ یہ تھا کہ حضورؐ کے احکام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں اور ہم ان میں تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ رہی صاحبِ موصوف کی دلیل تو وہ کل یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نمازیں اتنی نہ ہوں بلکہ اتنی ہوں، اور یوں نہ پڑھی جائیں، یوں پڑھی جائیں، جیسا کہ ان کے نزدیک حالات اور زمانے کا اقتضا ہو۔ پھر تو رسولِ خدا کے احکام نہ ہوئے کھیل ہو گئے۔ دوسری چیز جو میں نے کہی تھی وہ یہ تھی کہ اگر اسلامی ریاست کو زیادہ ضروریات درپیش ہوں تو وہ حدیث ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ کی رو سے مزید رقوم وصول کر سکتی ہے۔ خود یہی حدیث زکوٰۃ کی شرح کے مستقل ہونے پر اشارۃً دلالت بھی کرتی ہے۔ اگر زکوٰۃ کی شرح بدلی جا سکتی تو اس حدیث کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لیکن وہ صاحب اپنے موقف کی صداقت پر مصر ہیں۔ براہِ کرم آپ ہی اس معاملے میں وضاحت فرما دیجئے۔

جواب:

زکوٰۃ کے معاملے میں آپ نے جو استدلال کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ شارع کے مقرر کردہ حدود اور مقادیر میں ردّ و بدل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھل جائے تو پھر ایک زکوٰۃ ہی کے نصاب اور شرح پر زد نہیں پڑتی بلکہ نماز، روزہ، حج، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ترمیم و تنسیخ شروع ہو جائے گی اور یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ اس دروازے کے کھلنے سے وہ توازن و اعتدال ختم ہو جائے گا جو شارع نے فرد اور جماعت کے درمیان انصاف کے لیے قائم کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر افراد اور جماعت کے درمیان کھینچ تان شروع ہو جائے گی۔ افراد چاہیں گے کہ نصاب اور شرح میں تبدیلی ان کے مفاد کے مطابق ہو اور جماعت چاہے گی کہ اس کے مفاد کے مطابق۔ الیکشن میں یہ چیز ایک ISSUE بن جائے گی۔ نصاب گھٹا کر اور شرح بڑھا کر اگر کوئی قانون بنایا گیا تو جن افراد کے مفاد پر اس کی زد پڑے گی وہ اسے خوش دلی کے ساتھ نہ دیں گے، جو عبادت کی اصل روح ہے، بلکہ ٹیکس کی طرح چٹی سمجھ کر دیں گے اور (EVASION) اور (AVOIDANCE) دونوں ہی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ بات جواب ہے کہ حکمِ خدا اور رسول سمجھ کر ہر شخص سر جھکا دیتا ہے اور عبادت کے جذبے سے جو بھی رقم نکالتا ہے، اس صورت میں کبھی باقی رہ ہی نہیں سکتی کہ پارلیمنٹ کی اکثریت اپنے حسبِ منشا کوئی نصاب اور کوئی شرح لوگوں پر مسلط کرتی رہے۔ (ا م)

مکانوں کے کرایوں میں بلیک مارکٹنگ

سوال:

جس مکان میں میں رہتا ہوں، وہ مجھ سے پہلے ایک کرایہ دار نے پینتالیس روپے ماہانہ کرائے پر مالکِ مکان سے اس شرط پر لیا تھا کہ دو ماہ کے نوٹس پر خالی کر دیں گے۔ ان کرایہ دار سے یہ مکان انھی شرائط پر میرے بھائی نے لیا اور میں بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔ دو ماہ کے بعد میرے کہنے پر مالکِ مکان میرے نام سے رسید کاٹنے لگے۔ آٹھ ماہ تک برابر ہم پینتالیس روپے ماہانہ ادا کرتے رہے اور اس دوران میں کرائے کی زیادتی ہمارے لئے سخت موجبِ تکلیف رہی اور کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ رینٹ کنٹرولر کے یہاں درخواست دے کر کرایہ کم کرایا جائے مگر اس صورت پر دلی اطمینان نہیں ہو سکا۔ ستمبر میں مالکِ مکان کو سفیدی وغیرہ کرانے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو کرایہ دار کے فرائض میں سے ہے۔ آس پاس کے لوگوں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے اپنا سکوت توڑتے ہوئے یہ کہا کہ دو ماہ بعد جواب دوں گا (شاید مکان خالی کرانے کی دھمکی اس جواب میں مضمر تھی) اس پر کسی قدر تیز گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں میں نے رینٹ کنٹرولر کے یہاں کرایہ تشخیص کرنے کی درخواست دے دی۔ وہاں سے سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے کرایہ مقرر کر دیا گیا۔ مگر میرا ضمیر اس پر اب بھی مطمئن نہیں ہے۔

صاحب کے ذریعے یہ مکان حاصل ہوا تھا، ان کے اور ان کے عزیزوں کے کہنے سننے سے میں نے یہ صورت منظور کر لی کہ بتیس روپے ماہوار میں اس شرط پر دوں گا کہ میں مکان میں جب تک چاہوں رہوں، لیکن اگر کبھی مالکِ مکان نے مکان خالی کرایا تو پھر شرح سے کرایہ سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے محسوب ہوگا اور زائد وصول شدہ رقم مالکِ مکان کو واپس کرنی ہو گی۔ مالک مکان فی الحال اس شرط پر راضی نہیں ہے، لیکن ظاہر بات ہے کہ ان کو راضی ہونا پڑے گا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے میرے لئے کونسی صورت صحیح ہو گی؟ کیا

میں پینتالیس روپے ماہوار دیتا رہوں یا سولہ روپے گیارہ آنے ادا کیا کروں؟ نیز کیا میرے لئے ضروری ہے کہ جب مالکِ مکان مکان کے خالی کرنے کا مطالبہ کرے تو لازمًا خالی کر دوں یا اس امر واقعہ کو جانتے ہوئے کہ اسے مکان کی خود ضرورت نہیں ہے بلکہ محض کرایہ بڑھانے کے لئے دوسرے کرایہ دار کو دینا مطلوب ہے، میرے لئے جائز ہے کہ میں مطالبے کی تعمیل سے انکار کر دوں؟ ـــــ واضح رہے کہ مکانوں کی غیر معمولی قلت کی بنا پر پینتالیس کے بجائے پچاس روپے دینے والے کرائے دار بھی مل سکتے ہیں۔

مجھے صاف اور دو ٹوک جواب دیا جائے۔ جواب میں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں مالکِ مکان کو نصیحت کروں یا اس کا ظلم اس پر واضح کر دوں، کیونکہ یہ چیز بیکار ہوگی۔

جہاں تک مجھ سے ہو سکا، حقیقتِ واقعہ جیسی کچھ ہے، میں نے صاف صاف عرض کر دی ہے۔

جواب:

موجودہ حالات میں بڑے شہروں کے مالکانِ مکان مکانات کی قلت سے، اور لوگوں کی خصوصًا مہاجرین کی حاجتمندی سے انتہائی ناجائز فائدے اٹھانے پر تُل گئے ہیں۔ ان کے ساتھ اگر کوئی شخص معاہدہ کرتا بھی ہے تو برضا و رغبت نہیں کرتا بلکہ اُسی طرح کی مجبوری سے کرتا ہے جیسی سود پر قرض لینے والے حاجتمند کو لاحق ہوتی ہے۔ ایسے معاہدات کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں ہے، اور درحقیقت یہ معاہدے اس وجہ سے ہو رہے ہیں کہ حکومت کی طرف سے انصاف قائم کرنے اور لوگوں کی ضروریات منصفانہ شرائط پر بہم پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اب اگر حکومت نے منصفانہ کرائے مقرر کرنے کا کوئی انتظام کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اور دوسرے لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں جس مکان کا کرایہ از روئے انصاف سولہ روپے ہے، اگر ایک مالکِ مکان اس کا کرایہ پینتالیس پچاس روپے وصول کرتا ہے تو یقیناً وہ لٹیرا ہے۔ وہ آخر کونسا اخلاقی حق رکھتا ہے کہ آپ پر اس کا احترام کرنا واجب ہو۔ کل جو شخص غلّے کی کمی کی وجہ سے بلیک مارکٹنگ کرنے پر اتر آئے اور اپنا دس روپے من خریدا ہوا غلّہ اسّی روپے من کے حساب بیچنے لگے تو کیا اس کے بھی حقوقِ ملکیت کا احترام کیا جائے گا؟ اگر ہم حکومت کی مدد سے ایسے لوگوں کو مناسب شرح پر اپنا مال بیچنے پر مجبور کر سکتے ہیں تو کیوں نہ کریں؟ (ا۔م)

امام مہدی، مجددیت اور کشف و الہام

سوال :

کتاب "تجدید و احیائے دین" جس قدر بلند پایہ ہے اس کا اندازہ تو "کار تجدید کی نوعیت" کے عنوان سے تحریر شدہ مضمون اور مختلف مجددین امت کے کارناموں کی تفصیل سے ایک صاحب بصیرت بخوبی کر سکتا ہے۔ تاہم چند پہلو تشریح کے محتاج ہیں اور وہ درج ذیل ہیں :-

(۱) امام غزالی کے تذکرے کے آخر میں تین کمزوریاں جو آپ نے بیان کی ہیں (صفحہ ۴۰) یعنی (ا) علم حدیث میں امام کا کمزور ہونا (ب) عقلیات کا غلبہ اور (ج) تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونا، کیا ان کا ثبوت امام کی مشہور کتب احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ سے ملتا ہے؟ اور کیا وہ تصوف جس کا بیان انھوں نے ان کتابوں میں کیا ہے ایک مستحسن چیز نہیں ہے؟ نیز کیا مجدد وقت کو تمام ہم عصروں کے مقابلہ میں علم تک زیادہ نہیں دیا جاتا؟ اگر نہیں تو زمانے بھر میں اس کو ایک امتیاز خاص کیوں حاصل ہوتا ہے؟

(۲) مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ (ولی اللہ) صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرنے کی ضرورت تھی" (ص ۴۳)

اس کے متعلق بھی یہ باور کرنا مشکل ہے کہ حضرت مجدد اور شاہ صاحب اتنے ناقص البصیرت تھے کہ تصوف کی بیماری کا پورا اندازہ نہ لگا سکے۔ یہ حضرات علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی (بطریق کشف والہام) سے بھی بہرہ وافر رکھتے تھے۔ پھر ان حضرات نے مجدد ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے جس کا ذکر مولانا آزاد نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ خود حضرت مجدد نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ دور نبوت سے ہزار سال بعد جو مجدد آیا ہے وہ آپ کی ذات گرامی ہے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر قدرتی طور پر حسب ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) کیا ان دونوں حضرات کا اعلانِ مجددیت حکم خداوندی کے تحت نہ تھا، نیز کشف والہامات جن کا ذکر ان کی تصانیف میں ملتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ آخر وہ مجدد امر شرعی سے ہوئے یا امرِ تکوینی سے؟

(ب) کیا لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ مجدد لازماً اپنے دور کا وہ ممتاز انسان ہوتا ہے جو شریعت کے علوم کا (مع اسرار دین) سب سے بڑا عالم ہو اور قرب الی اللہ ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو دوسروں کو چھوڑ کر اس کارِ اہم کے لئے اسے کیوں مامور کیا جاتا ہے؟

(ج) مبشرات کی حقیقت کیا ہے؟

(د) کیا یہ حدیث صحیح نہیں کہ صدی کے سرے پر ایک مجدد آئے گا، اور کیا اسے مجددیت کا شعور رہنا ضروری نہیں؟

(۳) سب سے زیادہ جو چیز مجھے کھٹکی ہے وہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آپ کی وہ تحریر ہے جو ص ۵۳ سے شروع ہو کر ص ۵۲ تک ان الفاظ میں موجود ہے: "نمبر واقعہ یہ ہے۔۔۔ بی بی کی صحنک اور اس قسم کی نیازوں کا سلسلہ خود اس خاندان کی خواتین میں جاری تھا" اس پر مولانا منظور نعمانی کے اختلافی نوٹ کا حوالہ دے کر آپ نے لکھ دیا ہے کہ "ممکن ہے کہ یہ بیانات یا ان میں سے اکثر غلط ہوں" لیکن اس حصے کو کتاب سے خارج نہیں کیا۔ اب میں گزارش کرتا ہوں کہ جب یہ چیزیں جو شاہ صاحب کے خاندان کی طرف منسوب ہیں حتمی اور یقینی نہیں تو کیوں نہ آپ اس حصے کو کتاب سے خارج کر دیں؟

(۴) الامام المہدی کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ عام علماء کے بیان سے بہت مختلف ہوگا۔ حالانکہ علماء سے یہ سنا ہے کہ امام کا نام اور نسبت تک علاوہ دیگر علامات کے احادیث میں مذکور ہے۔ وہ خاص ماحول میں اور خاص علامات کے ساتھ نمودار ہوں گے، لوگ ان کو پہچان لیں گے اور زبردستی بیعت کر کے حاکم بنائیں گے اور اسی دوران میں آسمان سے آواز آئے گی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ الامام المہدی ہیں۔ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ "نبی کے سوا کسی کا یہ منصب نہیں ہے کہ دعوے سے

کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور رہا ہے۔ مہدیت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں (ص ۳۳)

میرا سوال یہ ہے کہ مذکورۂ بالا علامات دو نعت جو اکثر اہل علم مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب بہشتی زیور (ملاحظہ ہو) نے بیان کیے ہیں کیا احادیث صحیحہ پر مبنی نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو آپ کے بیان کی پشت پر کونسے دلائل موجود ہیں۔

جواب:

آپ کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ چند امور کی توضیح کر دوں جن کو سمجھ لینے سے آپ کی بہت سی الجھنیں خود بخود صاف ہو جائیں گی۔ اوّل یہ کہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم تعین کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ فلاں شخص مجدد تھا اور فلاں شخص نہ تھا۔ یہ تو ایک شخص کے کام کو دیکھ کر بعد کے لوگ یا خود اس کے ہم عصر لوگ یہ رائے قائم کرتے رہے ہیں کہ وہ مجدد تھا یا نہ تھا۔ اس میں اختلافات بھی بہت کچھ ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانے کے متعدد لوگوں کے متعلق بہت سے اہل علم کی یہ رائے ہے کہ وہ مجدد تھے مگر بعض نے ان کو مجدد نہیں مانا ہے۔ کوئی خاص علامت کسی کے ساتھ بھی لگی ہوئی نہیں ہے جس سے اس کے مرتبے کا تعین ہو سکے۔

دوم یہ کہ تجدید کسی دینی منصب کا نام نہیں ہے جس پر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے بامرِ شرعی مامور ہوتا ہو اور اس کو مجدد ماننے یا نہ ماننے سے کسی شخص کے عقیدۂ دینی پر کوئی اچھا یا برا اثر پڑتا ہو۔ یہ تو ایک لقب ہے جو کسی آدمی کو اس کے کارنامے کے لحاظ سے دیا جاتا ہے۔ ہمارے علم میں جس شخص نے بھی دین کو از سرِ نو تازہ کرنے کی کوئی خدمت انجام دی ہو، ہم اسے مجدد کہہ سکتے ہیں۔ اور دوسرے شخص کی رائے میں اگر اس کا کارنامہ اس مرتبے کا نہ ہو تو وہ اسے اس لقب کا مستحق ٹھیرانے سے انکار کر سکتا ہے۔ نادان لوگوں نے اس معاملے کو خواہ مخواہ اہم بنا دیا ہے۔ نبی صلعم نے جو خبر دی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مٹنے نہیں دے گا بلکہ ہر صدی کے سر پر ایسے شخص یا اشخاص کو اٹھاتا رہے گا جو اس کے دھندلے ہوتے ہوئے آثار کو پھر سے تازہ کر دیے کا یا کر دیں گے۔ حدیث میں "مَن" کا لفظ عربیت کے لحاظ سے اس بات کا متقاضی نہیں ہے کہ

ضرور وہ کوئی ایک ہی شخص ہو۔ اس کا اطلاق متعدد اشخاص پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور حدیث میں کوئی لفظ ایسا بھی نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ مجدد کو اپنے مجدد ہونے کا شعور بھی ہونا چاہیئے، یا یہ کہ لوگوں کے لیے مجدد کا پہچاننا بھی ضروری ہے۔

سوم، کسی شخص کے مجدد ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ہر لحاظ سے مردِ کامل ہے اور اس کا کام نقائص سے پاک ہے۔ اس کو مجدد قرار دینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اس کا مجموعی کارنامہ تجدیدی خدمت کی شہادت دیتا ہو۔ لیکن ہم سخت غلطی کریں گے اگر کسی کو مجدد قرار دینے کے بعد اس کو بے خطا سمجھ لیں اور اس کی ہر بات پر ایمان لے آئیں گے۔ نبی کی طرح مجدد معصوم نہیں ہوتا۔

چہارم مجددینِ امت کے کام پر میں نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بہرحال میری اپنی رائے ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ میری جس رائے سے چاہے اختلاف کرے۔ میں نے جن دلائل کی بنا پر کوئی رائے قائم کی ہے ان پر آپ کا اطمینان ہو تو اچھا ہے۔ نہ اطمینان ہو تو مضائقہ نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کسی رائے کو رد یا قبول کرنے کا انحصار دلیل اور تحقیق پر رکھیں، اکابر پرستی کے جذبے سے متأثر نہ ہوں۔

پنجم، پچھلے زمانے کے بعض بزرگوں نے بلاشبہ اپنے متعلق کشف و الہام کے طریقے سے یہ خبر دی ہے کہ وہ اپنے دور کے مجدد ہیں، لیکن انھوں نے اس معنی میں کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ ان کو مجدد تسلیم کرنا لوگوں کے لئے ضروری ہے اور جو ان کو نہ مانے وہ گمراہ ہے۔ دعویٰ کر کے اس کو ماننے کی دعوت دینا اور اسے منوانے کی کوشش کرنا سرے سے کسی مجدد کا منصب ہی نہیں ہے۔ جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ خود اپنے اس فعل ہی سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ فی الواقع مجدد نہیں ہے۔

ششم، کشف و الہام وحی کی طرح کوئی یقینی چیز نہیں ہے۔ اس میں وہ کیفیت نہیں ہوتی کہ صاحب کشف کو آفتابِ روشن کی طرح یہ معلوم ہو کہ یہ کشف یا یہ الہام خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اس میں غلط فہمیوں کا کم و بیش امکان ہوتا ہے۔ اسی لیے اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ کشف و الہام کے ذریعے سے کوئی حکمِ شرعی ثابت نہیں ہوتا، نہ اس ذریعۂ علم سے حاصل کی ہوئی کوئی چیز حجت ہے، نہ خود صاحبِ کشف کے لئے یہ جائز ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر پیش کئے بغیر کسی کشفی و الہامی چیز کی پیروی کرے۔

الامام المہدی کے بارے میں جو کچھ میں نے تجدید و احیائے دین میں لکھا ہے اس کی مزید توضیح مختلف لوگوں کے استفسار پر ترجمان القرآن کے متعدد نمبروں میں کر چکا ہوں۔ براہ کرم ان سب توضیحات کو آپ پڑھ لیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اُن روایات کے بارے میں میری کیا تحقیق ہے جن کی بنا پر علماء نے امام موصوف کے متعلق اتنی تفصیلات مرتب کر دی ہیں۔ میں ان تمام اکابر علماء کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ مگر کسی عالم کی ہر بات کو مان لینے کی عادت مجھے کبھی نہیں رہی۔ (ا۔م)

نماز کا مسنون طریقہ

سوال:

میں پہلے نماز ادا کرنے کی سعادت سے محروم تھا، لیکن الحمدللہ کہ اب نماز ادا کرتا ہوں۔ مجھ کو اس بارے میں بڑی پریشانی درپیش ہے۔ میں جس بستی میں تعلیم پا رہا ہوں، وہاں کے لوگ دیوبندی حنفی ہیں اور میرے گاؤں کے لوگ اہل حدیث ہیں۔ اب اگر میں نماز اہل حدیث کے طریقے پر ادا کرتا ہوں تو بستی کے لوگ مجھے وہابی کہہ کر پریشان کرتے ہیں اور جب حنفی طریقے پر پڑھتا ہوں تو گاؤں کے لوگ مقلد ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ چونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے، لہٰذا اس معاملے میں آپ سے رہنمائی چاہتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نماز ایک ہی طریقے پر پڑھی ہوگی، پھر مختلف فرقوں کے مختلف طریقوں کا اسلام میں کیا مقام ہے؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کونسا فرقہ آنحضور صلعم کے طریق پر نماز ادا کرتا ہے اور میں کس کے مسلک پر چلوں۔ یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ خود آپ کس طریق پہ نماز ادا کرتے ہیں۔

علاوہ بریں دیہات میں نماز جمعہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب:

اہل حدیث، حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی حضرات جن جن طریقوں سے نماز پڑھتے ہیں وہ سب طریقے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور ہر ایک نے معتبر روایات ہی سے ان کو لیا ہے۔ اسی بنا پر ان میں سے کسی گروہ کے اکابر علماء نے یہ نہیں کہا کہ ان کے طریقے کے سوا جو شخص کسی دوسرے طریقے پر نماز پڑھتا ہے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہ صرف بے علم لوگوں کا ہی کام ہے کہ وہ کسی شخص کو اپنے طریقے کے سوا دوسرے طریقے پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسے ملامت کرتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں ان سب طریقوں سے نماز پڑھی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو صرف اس امر میں کہ آپ عموماً کس طریقے پر عمل فرماتے تھے۔ جس گروہ کے نزدیک جو طریقہ آپ کا معمول بہ طریقہ ثابت ہوا ہے اس نے وہی طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

میں خود حنفی طریقے پر نماز پڑھتا ہوں، مگر اہل حدیث، شافعی، مالکی، حنبلی سب کی نماز کو درست سمجھتا ہوں اور سب کے پیچھے پڑھ لیا کرتا ہوں۔

دیہات میں نماز جمعہ کا مسئلہ بہت اختلافی ہے۔ حنفی اس کو جائز نہیں سمجھتے۔ اہل حدیث جائز سمجھتے ہیں۔ اور دوسرے فقہا کے مسالک بھی اس معاملے میں مختلف ہیں۔ آپ کے سوال کا مختصر جواب دوں تو غلط فہمی کا موجب ہوگا۔ مفصل جواب کا موقع نہیں۔ میں اس سے پہلے ترجمان القرآن میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور وہ سب مضامین اب میری کتاب تفہیمات حصہ دوم میں شائع ہونے والے ہیں۔

(ا۔م)

کمیشن اور نیلام

سوال:

حسب ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

(۱) بعض ایجنٹ مال سپلائی کرتے وقت دکاندار سے کہتے ہیں کہ اگر یہ مال فروخت کر کے ہمیں رقم دو گے تو ۲۰ فی صدی کمیشن ہم آپ کو دیں گے، اور اگر نقد قیمت مال کی ابھی دو گے تو ۲۵ فی صدی کمیشن ملے گا۔ کیا اس طرز پر کمیشن کا لین دین جائز ہے؟

(۲) مسلمان نیلام کنندہ کے لیے کیا یہ جائز ہے کہ جب کوئی شخص بولی نہ چڑھائے اور وہ دیکھے کہ

اس میں مجھے نقصان ہوگا تو وہ خود بولی دے کر مال کو اپنے قبضے میں یہ کہہ کر رکھ لے کہ یہ مال پھر دوسرے وقت میں نیلام ہوگا۔ نیز کیا وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے آدمی مقرر کر دے کہ وہ قیمت بڑھانے کے لئے بولی بولتے رہیں، یہاں تک کہ اس کے حسبِ منشا مال کی قیمت موصول ہو سکے۔

جواب:

(۱) نقد خریداری کی صورت میں زیادہ اور ادھار کی صورت میں کم کمیشن دینا میرے علم میں ناجائز نہیں ہے ایجنٹ (یا مالک) دوکانداروں کو مال فراہم کرتے وقت جو کمیشن دیتا ہے وہ دراصل اپنے منافع میں سے ایک حصہ اُس کو ادا کرتا ہے۔ اس حصے کو سودے کی نوعیت کے لحاظ سے کم و بیش کرنے کا اسے حق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی چیز سود سے مشابہ ہے۔ البتہ اگر ادھار کی مدت کے لحاظ سے کمیشن کی کمی کے درجے قائم کیے جائیں تو اس میں سود سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) نیلام کرنے والے کے لئے یہ تو درست ہے کہ اگر کسی مال پر اتنی بولی نہیں آتی جس پر اپنا مال بیچنے کے لئے صاحبِ مال راضی ہو، تو وہ فروخت نہ کرے۔ لیکن اس کے لیے دھوکے اور فریب سے کام لینا مناسب نہیں ہے۔ اس کو کھلے بندوں یہ بات ظاہر کر دینی چاہیے کہ دوسرے لوگوں کا جو مال وہ نیلام کے ذریعہ سے فروخت کر رہا ہے، یا خود اپنا خریدا ہوا جو مال وہ اس طریقے سے نکال رہا ہے، اس پر اگر کم سے کم مطلوبہ قیمت کی حد تک بولی نہ آئی تو وہ اس چیز کو فروخت نہ کرے گا۔ خریداروں میں اپنے آدمی بٹھا کر ان سے بولی دلوانا یا خود خریدار بن کر بولی دینا فریب کاری ہے۔ (ا۔م)

ایک نوجوان کے چند اہم سوالات

سوال:

(۱) ہمیں یہ کیونکر معلوم ہو کہ ہماری عبادت خامیوں سے پاک ہے یا نہیں اور اسے قبولیت کا درجہ حاصل ہو رہا ہے یا نہیں؟ ــــــــ قرآن و حدیث کے بعض ارشادات جن کا مفہوم یہ ہے کہ

بہت سے لوگوں کو روزے میں بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بہت سے لوگ اپنی نمازوں سے رکوع وسجود کے علاوہ کچھ نہیں پاتے، یا یہ کہ جو کوئی اپنے عابد سمجھے جانے پر خوش ہو تو نہ صرف اس کی عبادت ضائع ہوگئی بلکہ وہ شرک ہوگی، اور اس طرح سے دیگر تنبیہات جن میں عبادت کے لئے بے صلہ ہو جانے اور سزا دہی کی خبر دی گئی ہے دل کو نا امید و مایوس کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنی عبادت کو معلوم شدہ نقائص سے پاک کرنے کی کوشش کرے اور اپنی دانست میں کر بھی لے پھر بھی ممکن ہے کہ اس کی عبادت میں کوئی ایسا نقص رہ جائے جس کا اسے علم نہ ہو سکے اور یہی نقص اس کی عبادت کو لا حاصل بنا دے ــــــ اسلام کا مزاج اس قدر نازک ہے کہ اپنی بشریت کے ہوتے ہوئے اس کے مقتضیات کو پورا کرنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔

(۲) توجہ اور حضورِ قلب کی کمی کیا نماز کو بیکار بنا دیتی ہے؟ نماز کو اس خامی سے کیونکر پاک کیا جائے؟

نماز میں عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نہایت بے حضوری قلب پیدا ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے کیونکہ ہم سوچتے ایک زبان میں ہیں اور نماز دوسری زبان میں پڑھتے ہیں اگر آیات کے مطالب سمجھ بھی لئے جائیں تب بھی ذہن اپنی زبان میں سوچنے سے باز نہیں رہتا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اُن اعمال کے صلہ کا وعدہ کیا گیا ہے جن کا تمام مقصد اور تمام محرک صرف اس کی خوشنودی و رضا کا حصول ہو۔ مثلاً اگر کسی کی غربت و بے کسی پر رحم کھا کر ہم اس کی مدد کریں اور مدد کرنے میں اس کو ممنون کرنے یا اس سے آئندہ کوئی کام نکالنے یا کچھ لینے کا خیال نہ ہو بلکہ صرف اللہ کا واسطہ منظور ہو تو کیا یہ بھی شرک ہے؟ کیونکہ اس کے ساتھ سلوک کرنے کا ابتدائی محرک ہماری رقتِ قلب ہے۔ جس طرح آپ کے نزدیک خدمتِ ملت میں اگر کہیں قومیت کا رنگ پیدا ہو جائے تو عبادت نہیں رہتی۔

(۴) "پردہ" پڑھنے سے کافی تشفی ہوئی لیکن اکثر مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں الجھاؤ رفع نہیں ہوتا۔

ایک ایسا شخص جسے اس کے موجودہ حالات اور معاشی وسائل نکاح کرنے کی اجازت نہ دیں وہ آج کل کے زمانے میں کیونکر اپنی زندگی پاکبازی سے بسر کرے؟

میں نے اس کا جواب جس کسی سے بات کی، نفی میں پایا۔ ایک طرف موجودہ ماحول کی تہ بہ تہ رنگینیاں اور دوسری طرف چشم و گوش کی بھی حفاظت کا مطالبہ ناممکن العمل معلوم ہوتا ہے، کہاں آنکھیں میچیے اور کہاں کانوں میں انگلیاں دیجیے اور پھر یہ کہ...... خیالات کی آمد کو کیونکر روکئے۔ اول تو ہم اپنے خیالات کی آمد و رفت پر کوئی اختیار نہیں رکھتے اور اگر اس کی کوشش بھی کی جائے تو ایک ذہنی انتشار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا جو اور خراب کن ہے۔

سیلف کنٹرول (SELF-CONTROL) جن سازگار حالات میں قابلِ عمل ہو صرف انھیں حالات میں کارگر اور مفید ہو سکتا ہے لیکن ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف برانگیختگی کے فوج در فوج سامان ہوں اپنے آپ سے لڑنا اپنی شخصیت کے لئے ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ ایک صاحب جو میڈیکل سائنس میں اس سال ڈاکٹریٹ کی سند لے رہے ہیں کہتے ہیں کہ اس صورت میں نکاح جو کہ حاصل نہیں ہے، اس کے علاوہ، نیچرل طریق پر تسکینِ خاطر حاصل کرنا ہی صرف اس ذہنی انتشار اور تذلیلِ نفس سے نجات دے سکتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

کیا آپ بتائیں گے کہ بحالتِ مجبوری مذکورہ بالا رائے پر عمل پیرا ہو جانا کس حد تک گناہ ہے، اور اگر یہ سراسر گناہ ہے تو پھر ان حالات میں صحیح راستہ کیا ہوگا جو معقول اور قابلِ عمل ہو؟

امید ہے کہ آپ ان مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے نفسیاتِ انسانی کے حقائق کی پوری رعایت فرمائیں گے۔

جواب:

(۱) اسلام کا مزاج بلاشبہ بہت نازک ہے، مگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں فرماتا۔ قرآن و حدیث میں جن چیزوں کے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عبادات کو باطل یا بے وزن کر دینے والی ہیں ان کے ذکر سے دراصل عبادات کو مشکل بنانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ انسان کو ان خرابیوں پر متنبہ کرنا ہے

مقصود ہے تاکہ انسان اپنی عبادات کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے، اور عبادات میں وہ روح پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہو جو مقصود بالذات ہے۔ عبادات کی اصل روح تعلق باللہ، اخلاص للہ اور تقویٰ و احسان ہے۔ اس روح کو پیدا کرنے کی کوشش کیجیے، اور ریا سے، فسق سے، دانستہ نافرمانی سے بچیے۔ ان ساری چیزوں کا محاسبہ کرنے کے لیے آپ کا اپنا نفس موجود ہے۔ وہ خود ہی آپ کو بتا سکے گا کہ آپ کی نمازیں، آپ کے روزے میں، آپ کی زکوٰۃ اور حج میں کس قدر اللہ کی رضا جوئی اور اس کی اطاعت کا جذبہ موجود ہے، اور ان عبادتوں کو آپ نے فسق و معصیت اور ریا سے کس حد تک پاک رکھا ہے۔ یہ محاسبہ اگر آپ خود کرتے رہیں تو ان شاء اللہ آپ کی عبادتیں بتدریج خالص ہوتی جائیں گی اور جتنی وہ خالص ہوں گی آپ کا نفس مطمئن ہوتا جائے گا۔ ابتداءً جو نقائص محسوس ہوں ان کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ آپ مایوس ہو کر عبادت چھوڑ دیں، بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اخلاص کی پیہم کوشش کرتے جائیں۔ خبردار رہیے کہ عبادت میں نقص کا احساس پیدا ہونے سے جو مایوسی کا جذبہ ابھرتا ہے اسے دراصل شیطان ابھارتا ہے اور اس لیے ابھارتا ہے کہ آپ عبادت سے باز آ جائیں۔ یہ شیطان کا وہ پوشیدہ حربہ ہے جس سے وہ طالبینِ خیر کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود معلوم کرنا بہرحال کسی انسان کے امکان میں نہیں ہے کہ اس کی عبادات کو قبولیت کا درجہ حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس کو جاننا اور اس کا فیصلہ کرنا صرف اس ہستی کا کام ہے جس کی عبادت آپ کر رہے ہیں اور جو ہماری آپ کی عبادتوں کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ ہر وقت اس کے غضب سے ڈرتے رہیے اور اس کے فضل کے امیدوار رہیے۔ مومن کا مقام بین الخوف والرجاء ہے۔ خوف اس کو مجبور کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہتر بندگی بجا لانے کی کوشش کرے اور یہ توقع اس کی ڈھارس بندھاتی ہے کہ اس کا رب کسی کا اجر ضائع کرنے والا نہیں ہے۔

(۲) توجہ اور حضورِ قلب کی کمی نمازیں نقص ضرور پیدا کرتی ہے، لیکن فرق ہے اُس بے توجہی میں جو نادانستہ ہو اور اس میں جو دانستہ ہو۔ نادانستہ پر مواخذہ نہیں ہے بشرطیکہ انسان کو دورانِ نماز میں جب کبھی اپنی بے توجہی کا احساس ہو جائے اسی وقت وہ خدا کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کرے اور اس معاملے میں غفلت سے کام نہ لے۔ رہی دانستہ بے توجہی، بے دلی کے ساتھ نماز پڑھنا اور نماز میں قصداً دوسری باتیں سوچنا، تو بلاشبہ یہ نماز کو بیکار کر دینے والی چیز ہے۔ عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر جو بے حضوری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کی تلافی جس حد تک ممکن ہو

نماز کے اذکار کا مفہوم ذہن نشین کرنے سے کر لیجئے۔ اس کے بعد جو کمی رہ جائے اس پر آپ عنداللہ ماخوذ نہیں ہیں، کیونکہ آپ حکم خدا و رسول کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اس بے حضوری پر آپ سے اگر مواخذہ ہو سکتا تھا تو اس صورت میں جب کہ خدا اور رسول نے آپ کو اپنی زبان میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہوتی اور پھر آپ عربی میں نماز پڑھتے۔

(۳) آپ کا تیسرا سوال واضح نہیں ہے۔ اگر کسی کی غربت و بے کسی پر رحم کھا کر آپ صرف اللہ واسطے اس کی مدد کریں تو یہ فعل ظاہر ہے کہ خالص رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہوگا، اس کے مشرک ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اور اس سے میرے قول کی نفی کیسے لازم آتی ہے؟ اس کی ابتدائی محرک آپ کی رقت ہی سہی، مگر رقتِ قلب کی تحریک پر جو کام آپ نے کیا وہ تو اللہ کا پسندیدہ کام ہی کیا اور اس غرض کے لئے کیا کہ اللہ اسے پسند فرمائے۔ اسی طرح اگر آپ اپنی قوم کی کوئی خدمت اس طریقے سے کریں جو اللہ کا پسندیدہ طریقہ ہو، اور اس غرض کے لئے کریں کہ اللہ اس خدمت سے خوش ہو تو یہ عین عبادت ہے۔ میں جس چیز کا مخالف ہوں وہ تو یہ ہے کہ قوم کی خاطر وہ کام کیے جائیں جو اللہ کو پسند نہیں ہیں اور ایسے طریقے سے کئے جائیں جو اللہ کی بتائی ہوئی راہ کے خلاف ہیں۔

(۴) آپ کا یہ سوال ان اہم مسائل میں سے ہے جن کی بنا پر ہم موجودہ ناپاک ماحول کے خلاف اجتماعی جدوجہد کی ضرورت پر برسوں سے زور دے رہے ہیں۔ بلاشبہ آج کل کے ماحول نے افراد کے لئے پاک رہنے کو سخت مشکل بنا دیا ہے۔ لیکن اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس ماحول کی خرابی کو حیلہ بنا کر افراد اپنے لئے اخلاقی بے قیدی کے جواز کی راہ نکالنے لگیں۔ بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ اس ماحول کی ناپاکی کا جتنا زیادہ شدید احساس آپ کے اندر پیدا ہو اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اسے بدلنے کی جدوجہد میں حصہ لیں۔ رہیں وہ مشکلات جو اس جدوجہد کے دوران میں ایک نوجوان کو اس ناپاک ماحول کے اندر پیش آتی ہیں، تو ان کا علاج یہ ہے کہ جن ہیجان خیز چیزوں سے آپ بچ سکتے ہوں ان سے بچیے، مثلاً سینما، فحش تصویریں، فحش لٹریچر، مخلوط سوسائٹی، بے پردہ عورتوں کو دانستہ گھورنا، یا ان کی صحبت میں بیٹھنا۔ اس کے بعد جو اضطراری محرکات باقی رہ جاتے ہیں وہ اتنے زیادہ اشتعال انگیز نہیں رہتے کہ آپ ان کی وجہ سے بندشِ تقویٰ کو توڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ کے ڈاکٹر دوست، اور جن ماہرینِ نفسیات کا آپ ذکر کر رہے ہیں، دراصل اس بات سے ناواقف ہیں کہ زنا انسانی تمدن و اخلاق کے لئے کس قدر شدید مفسد و مخرب چیز ہے۔ اگر وہ اس چیز کی برائیوں سے واقف ہوں تو کسی انسان کو

یہ مشورہ نہ دیں کہ وہ محض اپنے نفس کی تسکین کے لئے سوسائٹی کے خلاف اتنے سخت جرم کا ارتکاب کر گزرے۔ کیا یہ لوگ کسی شخص کو یہ مشورہ دینے کی جرأت کریں گے کہ جب کسی کے خلاف اس کا جذبہ انتقام ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ اسے قتل کر دے، اور جب کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش اسے بہت ستائے تو وہ چوری کر ڈالے؟ اگر ایسے مشورے دینا وہ ناجائز سمجھتے ہیں تو جذبہ شہوت کی تسکین کے لئے وہ زنا کا مشورہ دینے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ حالانکہ زنا کسی طرح بھی قتل اور چوری سے کم جرم نہیں ہے۔ آپ اس جرم کی شدت کو سمجھنے کے لئے ایک مرتبہ پھر میری کتاب پردہ کے وہ حصے پڑھئے جن میں میں نے زنا کے اجتماعی نقصانات پر بحث کی ہے۔ (ا۔م)

۱۹۴۷ء کے فساد اور اموالِ متروکہ کا حکم وغیرہ

سوال:

(۱) موجودہ پاکستان دار الحرب ہے یا دار الامن (دار الاسلام)؟

(۲) ۱۹۴۷ء میں جو ہندو مسلم فساد پاکستان میں ہوا اس میں ہندوؤں کے اموال مسلمانوں پر حلال تھے یا حرام؟ اور ان کے قتل کا اس صورت میں مواخذہ قیامت میں ہوگا یا نہ جب کہ انھوں نے کوئی پیش دستی نہ کی ہو؟

(۳) ہندوؤں کے اموالِ متروکہ جواب موجود ہیں وہ کس کی ملکیت شمار ہوں گے، نیز ان اموال کا کوئی حصہ ایک مسلمان اپنے تصرف میں لائے تو اس کے لئے ازروئے شریعت کیا حکم ہے؟

(۴) اگر حکومتِ پاکستان کا کوئی سرکاری ملازم اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں بغیر اجازت افسران کچھ وقت مسجد کی مرمت میں صرف کرے تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب:

ان سوالات کے جواب میں فتویٰ دینا تو کسی مفتی کا کام ہے۔ آپ پاکستان کے صاحب فتویٰ علماء میں سے

کسی سے رجوع فرمائیں۔ البتہ ان سوالات کا شرعی جواب جو میرے علم میں ہے عرض کئے دیتا ہوں:

(۱) پاکستان شرعی اصطلاح کے مطابق اب دارالاسلام ہے۔

(۲) ۱۹۴۷ء کے فسادات کی حیثیت کسی ایک جگہ کے مقامی فساد کی سی نہ تھی کہ ہر جگہ کے فساد کا الگ الگ حکم ہو بلکہ انھوں نے ایک قومی جنگ کی حیثیت اختیار کر لی تھی یعنی غیر منقسم ہندوستان میں بحیثیت مجموعی مسلم قوم اور ہندو سکھ قوم کے درمیان اجتماعی دشمنی پیدا ہوگئی تھی اور اس نے بڑھتے بڑھتے جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس حالت میں ظلم و زیادتی دونوں طرف سے ہوئی اور بھلے برے کی تمیز کے بغیر ہر فریق نے بدتر سے بدتر مظالم کا ارتکاب کیا۔ ہمارے نزدیک اس معاملے میں فریقین قصور وار رہیں اور ظلم جس نے بھی کیا ہے برا کیا ہے۔

(۳) ہندوؤں اور مسلمانوں کے اموالِ متروکہ جو اس وقت ہندوستان و پاکستان میں موجود ہیں، سردست کسی کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ دونوں حکومتوں کے پاس اس وقت تک کے لئے امانت ہیں جب تک کہ فریقین میں ان اموال کے متعلق کوئی معاہدہ نہ ہو جائے۔ اس دوران میں کسی فرد کے لئے حلال نہیں ہے کہ ان اموالِ متروکہ میں بطور خود کسی قسم کا تصرف کرے۔

(۴) حکومت کے ملازم کو اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں سرکاری فرائض کے ماسوا دوسرے کام نہ کرنے چاہئیں، بجز اُن کاموں کے جن کی سرکاری طور پر اجازت ہو، یا اُن فرائض کے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کئے گئے ہوں۔ (ا۔م)

مقامِ صبر

سوال:

مجھے مولانا صاحب ناظم مدرسہ عربیہ سے جماعت اسلامی کے موضوع پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ انھوں نے آپ پر مہدی ہونے کا الزام لگایا اور اپنی ملاقات کا تذکرہ فرمایا۔ حاضرین کے دلوں پر کئی قسم کے توہمات غالب آئے۔ کیا جناب نے ظہورِ مہدی علیہ السلام کی علامات اپنی ذات سے

منسوب فرمائیں اور ان کے اصرار پر تحریری انکار یا اقرار سے پہلو تہی فرمائی؟ مہربانی فرماکر بذریعۂ اخبار میرے استفسار کا جواب باصواب عطا فرمائیں۔

جواب:

مولانا اور ان کے گروہ کے علماء نے میرے خلاف جو پروپیگنڈا شروع کیا ہے اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ مگر میرے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ بارہا اس طرح کے لوگوں نے طرح طرح کے جھوٹ میرے خلاف پھیلانے کی کوشش کی ہے اور میں نے ہمیشہ ان کے مقابلے میں صبر سے کام لیا ہے۔ میرا اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا۔

مولانا صاحب موصوف اور ان کے ساتھیوں نے یہاں آکر مجھ سے جو باتیں کیں اور پھر واپس جاکر جو باتیں شائع کیں، ان دونوں کے فرق پر جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دل خدا کے خوف اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے بالکل خالی ہو چکے ہیں اور انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا ہے، آگے کوئی نہیں جہاں اپنے اقوال و اعمال کا انھیں حساب دینا ہوگا۔

میرا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے اور میں آئندہ بھی اسی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خدا کے خوف سے خالی پاتا ہوں ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بدلہ لینا میرے بس میں نہیں ہے، خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے۔ اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ان کے جھوٹ کی تردید کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ ان کا پردہ انشاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا۔ اس لئے آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں ان کے جواب میں کوئی بیان کسی اخبار کو بھیجوں گا۔

میری کتاب تجدید و احیائے دین جس کی بعض عبارتوں کو غلط معنی پہنا کر وہ مجھے مدعی مہدویت قرار دے رہے ہیں آج کوئی نئی تصنیف نہیں ہے، آج سے دس سال پہلے شائع ہوئی تھی، اس وقت سے اب تک برابر شائع ہوتی رہی ہے، اور اب بھی ہر جگہ آپ کو مل سکتی ہے۔ آپ اس کو خود دیکھیں، دو چار سطروں یا چند فقروں کو نہیں، پوری کتاب کو پڑھیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ میں نے اس میں اپنی مہدویت یا مجددیت کا دعویٰ کیا ہے یا دعوے کرنے والوں کی تردید کی ہے؟ (ا م)

ایک گمنام خط کا جواب

سوال :

میں نے ایک دوشیزہ کو لالچ دیا کہ میں اُس سے شادی کروں گا۔ پھر اس کے ساتھ خلافِ اخلاق تعلقات رکھے۔ میں نہایت دیانتداری سے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس لڑکی کے خاندان کی عام عورتیں زانیہ اور بدکارہ ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کی ماں بھی۔ اب مجھے خوف ہے کہ اگر میں اس لڑکی سے شادی کرلوں تو وہ بھی بدچلن ثابت نہ ہو۔ ترجمان القرآن کی اشاعت میں مطلع کیجئے کہ مجھے کیا کرنا چاہئیے۔

جواب :

یہ ایک گمنام خط ہے جو ہمیں حال میں وصول ہوا ہے۔ عموماً گمنام خطوط جواب کے مستحق نہیں ہوا کرتے۔ لیکن اس کا جواب اس لئے دیا جارہا ہے کہ ہماری بدقسمت سوسائٹی میں اس وقت بہت سے ایسے نوجوان موجود ہیں جن کے اندر سائل کی سی ذہنیت پائی جاتی ہے، جو خود بدکار ہیں مگر شادی کے لئے کوئی ایسی لڑکی چاہتے ہیں جو عفیفہ ہو، اور جن کی خواہش یہ ہے کہ جس ظرف کو انھوں نے خود گندا کیا ہے اسے دوسروں کے لئے چھوڑ کر اپنے لئے کوئی ایسا ظرف تلاش کریں جسے کسی نے گندہ نہ کیا ہو۔

جناب سائل سے گزارش ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے خود شادی سے پہلے خراب کیا ہے اس کے لئے آپ سے زیادہ موزوں کون ہوسکتا ہے، اور وہ آپ سے زیادہ اور کس کے لئے موزوں ہوسکتی ہے؟ آپ کو اپنے لئے نیک چلن لڑکی کیوں درکار ہے جب کہ آپ خود بدچلن ہیں؟ جب اس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنے جسم کو آپ کے حوالے کیا تھا کیا اُسی وقت آپ کو یہ معلوم نہ ہوگیا تھا کہ وہ بدچلن ہے؟ پھر آپ کو اب یہ اندیشہ کیوں لاحق ہوا کہ آگے چل کر وہ کہیں بدچلن ثابت نہ ہو؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے ملوث ہونا تو نیک چلنی ہے اور بدچلنی صرف دوسروں سے ملوث ہونے کا نام ہے؟ پھر اس کے خاندان کی عورتوں پر آپ کا اعتراض بھی عجیب ہے۔ وہ خواتین کرام جیسی کچھ بھی ہیں، اسی لئے ہیں کہ آپ جیسے معزز اصحاب سے ان کو سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ آپ

اگر اس راہ پر بعد میں آئے ہیں تو آخر اپنے پیش روؤں کے انجام دیے ہوئے کارناموں سے اس درجہ نفرت کیوں ظاہر فرماتے ہیں؟ برا نہ مانیے۔ آپ دانستہ یا نادانستہ ٹھیک اُس خاندان میں پہنچ گئے ہیں جس کے لیے آپ موزوں تر ہیں اور جو آپ کے لیے موزوں تر ہے۔ کسی دوسرے پاکیزہ خاندان کو خراب کرنے کے بجائے آپ اُسی خاندان میں ٹھیر جائیں جس کو آپ جیسے لوگ پہلے خراب کر چکے ہیں اور جسے خراب کرنے میں آپ کا حصہ بھی شامل ہے۔

آخر میں محترم سائل کو قرآن کی دو آیتیں بھی سن لینی چاہئیں۔ پہلی آیت یہ ہے:

الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ،	زانی مرد نکاح نہیں کیا کرتا مگر ایک زانیہ یا مشرکہ عورت
والزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک ج	سے۔ اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کیا کرتا مگر ایک
وحرم ذالک علی المومنین (النور - ۱)	زانی اور مشرک۔ اور ایسا کرنا مومنین پر حرام ہے۔

اس آیت میں "نکاح نہیں کیا کرتا" سے مطلب یہ ہے کہ زانی مرد اس لائق نہیں ہے کہ اس کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے سوا کسی اور سے ہو۔ اور زانیہ عورت کے لئے اگر کوئی شخص موزوں ہے تو زانی یا مشرک مرد، نہ کہ کوئی مومن صالح۔ دوسری آیت یہ ہے:

الخبیثٰت للخبیثین والخبیثون للخبیثٰت	بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لئے ہیں اور بدکار مرد
والطیبٰت للطیبین والطیبون للطیبٰت۔	بدکار عورتوں کے لئے۔ اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ
	مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے۔

مکتوبِ جرمنی

{ذیل میں ایک خط اور ایک طویل مراسلہ درج کیا جا رہا ہے جو حال میں ہم کو جرمنی سے وصول ہوا ہے۔ صاحبِ مکتوب کی اپنی خواہش بھی یہ ہے کہ ان کے اس مراسلے کو شائع کیا جائے، اور ہم خود بھی یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے ان سب لوگوں تک پہنچا دیا جائے جو اشاعتِ دین سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس مراسلے میں بڑی خوبی کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ دو لڑائیوں میں شکست کھانے کے بعد اس وقت جرمن قوم کس حالت میں ہے اور اس کے اسلام سے متاثر ہونے کے امکانات کس حد تک روشن ہیں۔ جماعت اسلامی دل سے چاہتی ہے کہ عبدالرحمٰن ردسلر صاحب اور ان کی حزبِ اسلامی کو اسلام سے متعلق مفید لٹریچر فراہم کر کے دے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک ہمارے لٹریچر کے انگریزی تراجم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ اگر کچھ خدا کے بندے اس خدمت کے لئے آگے بڑھیں اور انگریزی تراجم کی اشاعت میں ہماری قلمی اور مالی اعانت کریں تو انشاء اللہ نہ صرف جرمن قوم تک، بلکہ دنیا کی دوسری قوم تک بھی دینِ حق کا پیغام پہنچانے کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے}

جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

السلام علیکم

برادرِ اسلام! میں انتہائی مسرت اور گہرے جذبۂ احترام کے ساتھ آپ کی تازہ ارسال کردہ اسلامی کتابوں کی وصولی کی اطلاع آپ کو دیتا ہوں۔ یہ کتابیں صرف میرے لئے ہی نہیں بلکہ یہاں ہم سب کے لئے غایت درجہ دلچسپ مفید اور قابلِ قدر ہیں۔ میں اپنی جماعت کی طرف سے آپ کی اس عنایت کا انتہائی مخلصانہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ فی الواقع جرمنی میں اشاعتِ اسلام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کے خیالات و افکار یہاں کے لوگوں تک پہنچیں۔ چنانچہ میں اس خط کے ساتھ آپ کی رہنمائی کے لئے اس ملک کے حالات کی ایک روداد بھیج رہا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ ہمیں اپنے عزیز اسلامی مقاصد کے لئے یہاں کس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔

میں آپ سے یہ درخواست کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ آپ اپنے ذاتی ارشادات سے بھی ہمیں نوازیں کیونکہ ہمارے کام میں آپ کی شخصی اور مخلصانہ دلچسپی ہمارے لئے ممنونیت کا باعث ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ میں بخوشی باہمی روابط کو بڑھانے کے لئے ہر سعی کرنے کے لئے تیار ہوں، بلکہ فی الحقیقت آپ مجھے یہاں اپنا نمائندہ شمار کرسکتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ اسلام سے متعلق آپ کی تجاویز اور معلومات کو بڑے وسیع اور بااثر حلقوں کے اندر بجنسہٖ پوری دیانت اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ اور یہ سب کچھ اس اسلامی اخوت کی بنا پر ہوگا جس کے لئے ہم اخلاص کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

میں آپ کی طرف سے جلد جواب آنے کی توقع رکھتا ہوں اور خلوص، شکریہ اور احترام کے جذبات پیش کرتا ہوں۔

المخلص فی الاسلام

عبدالرحمٰن روسلر

[جس روداد کا اوپر کے خط میں حوالہ دیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے]

حزبِ اسلامی ہمبرگ

سنہ ۱۹۴۵ء میں جرمنی کی شکست کے فوراً بعد مسٹر عمر شوبرٹ (OMAR SCHU BERT) مسٹر عبدالرحمٰن روسلر (RÖSELER) اور دوسرے مسلمان رفقا کی جدوجہد کے نتیجے میں ہمبرگ کی 'حزبِ اسلامی' کی دوبارہ تنظیم ہوئی۔ ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو اسے حکومت نے سرکاری طور پر تسلیم کرلیا اور اس تحریک نے باقاعدہ طور پر اپنے نصب العین کے لئے کام کرنا شروع کردیا۔ کام کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ 'حزبِ اسلامی' کا مسلمانوں کے کسی خاص فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کے سامنے اسلام کا کوئی محدود تصور ہے، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا 'حزبِ اسلامی' کا دنیا کے ہر مسلمان سے اور ہر اس شخص سے جو اسلام سے دلچسپی رکھتا ہو، یکساں تعلق ہے۔ ہماری مخلصانہ اسلامی محبت واخوت عالمگیر، عمومی، دائمی، مستحکم، سچی اور بے لوث ہے۔ ہم اپنے اللہ کے اطاعت گزار ہیں اور اس کی حمد وستائش کے ساتھ ہم اس کی پوری کائنات اور مخلوق کے ساتھ یکساں محبت رکھتے ہیں، متعدد اسلامی اداروں سے ہمارے

مضبوط اور محبت آمیز روابط ہیں۔ ہم اُن کے قابلِ احترام اسلامی تصورات کا یکساں طور پر دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں ان کی اصلی اور صاف ستھری صورت میں ایک باوقار دینی دسترخوان پر چُن دیتے ہیں جہاں سے ہر شخص اُن سے استفادہ کر سکتا ہے اور بذاتِ خود اسلام کی عظمت کا مشاہدہ کر کے اس حقیقت کو پہچان سکتا ہے کہ ان جملہ تصورات میں ایک ہی خالص، غیر فانی اور حیات بخش روح موجود ہے ـــــــ وہی روح جو ہر ایک مومن صادق کے دل میں زمان و مکان کی قید سے بے نیاز ہو کر جاری و ساری ہے۔

۱۔ مسٹر عمر شوبرٹ ۶۔ فروری ۱۹۰۵ء کو برلن میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۔ فروری ۱۹۳۰ء کو عقلی دلائل سے مطمئن ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ آپ کو 'حزبِ اسلامی' کا صدر منتخب کیا گیا۔ کیونکہ آپ نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور حزبِ اسلامی کے امورِ داخلی و خارجی کو نہایت عمدہ طریقے سے منظم کیا تھا۔ آپ نے انتہائی خطرات کے مواقع پر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تعلق باللہ کا ثبوت بہم پہنچایا۔ آپ کا وسیع حلقۂ احباب پوری دنیا پر پھیلا ہوا ہے۔ حکمتِ دین اور اسلامی تاریخ سے آپ کو خاص شغف ہے۔ کئی مقالوں کے مصنف ہیں اور چیدہ حاضرین کے مجمعوں میں انھوں نے بارہا اسلامی موضوعات پر تقریریں کی ہیں۔ آپ کی زندگی کلیتہً خدمتِ دین کے لئے وقف ہے۔

۲۔ مسٹر فرانز ایرک عبدالرحمٰن روسلر (MR. FRANZ ERICH ABDURRAHMAN RÖSELER) ۵۔ اپریل ۱۹۳۱ء کو ہیمبرگ میں پیدا ہوئے۔ جون ۱۹۴۲ء میں باقاعدہ طور پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں انھوں نے ایک اہم خواب دیکھا جس میں انھیں اشارہ ہوا کہ وہ اسلام کے مشن کے حامل ہیں۔ آخر کار انھوں نے اس مقصد کے لئے اپنے آپ کو بالکل فارغ اور یکسو کر لیا۔ دین کی خاطر یہ بھی کئی مرتبہ جان پر کھیل چکے ہیں۔ اپنے ایمان اور صلاحیتوں کی بنا پر ان کو حزبِ اسلامی کا نائب صدر اور باقاعدہ نمائندہ تجویز کیا گیا۔ ان کی خاص ذمہ داری یہ ہے کہ وہ امورِ خارجہ کے نگران ہیں۔ اُن کے بارے میں کچھ معلومات میر لائق علی صاحب آپ کو دے چکے ہیں جس کے لئے ہم اُن کے ممنون ہیں۔ روسلر صاحب ایک مانے ہوئے عالم دین اور خطیب ہیں۔ جرمنی کی انجمن مصنفین کے رکن ہیں۔ اُن کے دینی مقالے اورینٹل پوسٹ، برلن اور اسلامک ریویو، انگلینڈ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ نیچرل ایسوسی ایشن کلچر کے بھی رکن ہیں اور اصولِ دین کو علوم سائنس پر منطبق کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ تمام غیر ملکی مراسلت کے انچارج وہی ہیں۔ حزبِ اسلامی کے دارالضیافہ میں جتنے استقبالات، دعوتیں، اجتماعات اور خطابات

ہوتے ہیں اُن کا انتظام انھی کے سپرد ہے۔ یہ مہمان خانہ ٹریمز بیوٹل (TREMSBUTTEL) کے قصر میں قائم کیا گیا ہے۔ جو شمالی جرمنی کے خوبصورت ترین اور خوش منظر ترین قصروں میں سے ایک ہے اور اپنے قدیم رومانوی پارک کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہے۔ بارگٹے ہائڈ (BARGTEHEIDE) میں اُن کا ایک عمدہ مکان اور باغ ہے۔

مسٹر عمر شوبرٹ اور مسٹر عبدالرحمٰن روسلر کی سالہا سال کی دیرینہ رفاقت ہے۔ وہ ہمیشہ مل کر کام کرتے رہے ہیں۔ اُن کے برلن مسجد سے دوستانہ روابط تھے۔ جب 'حزبِ اسلامی' کی تنظیم مستحکم ہوگئی تو برلن مسجد سے روابط اور گہرے ہوگئے اور برلن مسجد کے تعاون سے اس امر پر اتفاق ہوگیا کہ عمر شوبرٹ ہیمبرگ کے دفاتر کے ناظم رہیں اور عبدالرحمٰن روسلر برلن مسجد کی جمعیتِ مسلمین اور یونیورسل اسلامک یونین (اسکندریہ) کی مقامی شاخ کے ڈائرکٹر رہیں اور انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کے لٹریچر کی اشاعت کے ذمے دار ہوں۔ اس کام میں مزید توسیع کی توقع ہے۔ اسلام کے لئے ہماری متحدہ مساعی کو اس تعاون سے بے حد فائدہ پہنچا۔ برلن مسجد اپنے خاص حالات کی وجہ سے اپنے کام کو صرف برلن کے تنہا شہر میں ہی مرتکز کرسکی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم پورے مغربی جرمنی میں پُرخلوص سرگرمی اور امکانی حد تک بہترین ذرائع کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ باہمی امداد اور مشوروں سے اس کام کو اور زیادہ تقویت پہنچ رہی ہے۔

جرمنی کی موجودہ ذہنی کیفیت

ماضی قریب اور ماضی بعید کے ہنگامہ خیز واقعات نے یہاں ذہنوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں جو ابھی تک پورے طور پر محو نہیں ہوسکے ہیں۔ ان واقعات میں سے اہم ترین گزشتہ دو عالمگیر لڑائیاں ہیں جن میں سے دوسری ابھی ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی ہے۔ اس کے بعد بدحالی، اخلاقی بے راہروی، عدم تحمل، چالبازی، بہتان تراشی، بے انصافی، ظلم و ستم، خودکشی، قتل و غارت، چوری، بے ضمیری، سوئے ظن، خودغرضی، بے دینی اور خداو خلق سے بیزاری کا دور دورہ ہوگیا۔ اجتماعی نظربندی کے کیمپ وجود میں آئے جہاں لاکھوں مرد عورتیں اور بچے قتل کردیے گئے یا اپاہج اور بیکار بنا دیے گئے۔ بیماری اور موت چاروں طرف منہ کھولے پھرتی تھی۔ لاکھوں پناہ گزین اپنی املاک کھو دینے کے بعد بمباریوں سے جلی بھنی ہوئی آبادیوں میں زندگی اور موت کی کشمکش میں

مبتلا تھے۔ ضروریاتِ زندگی پر کنٹرول تھا مگر فراہمی و رسد کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اخلاقی گراوٹ نے ان حالات میں چور بازاری اور دیگر اخلاقی جرائم کو جنم دیا۔ نوجوان نسل جو باطل مگر دلفریب نظریات کی شدت سے معتقد تھی اپنی غلطیوں کے انکشاف کے بعد مہلک ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی۔ مگر ان تلخ شواہد کے باوجود بعض ابھی تک اپنی غلط روی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

مغربی جرمنی کی ریاست کے قیام تک کے حالات

جب جنگ ختم ہوئی تو جرمنی عملاً مغربی اور مشرقی دو باہم مخالف خطوں میں بٹ چکا تھا۔ اس تقسیم کو اب قطعی تصور کیا جا سکتا ہے۔ مغربی جرمنی پہلے ہی گنجان آباد تھا۔ اب یہاں مشرقی جرمنی کے پناہ گزینوں کی درآمد کا بھی تانتا بندھ گیا۔ اشیاء کے کنٹرول، نایابی اور چور بازاری کا وہی عالم تھا۔ زرِ کاغذی کی گردش میں مسلسل اضافہ اور قیمت میں مسلسل تخفیف ہوتی چلی گئی۔ بے شمار لوگ بے روزگار ہو گئے۔ لولے، لنگڑے، بیمار، بھکاری، مصیبت زدہ بچے اور بوڑھے لکھوکھا کی تعداد میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ نہ ان کا گھر بار تھا، نہ اعزہ و اقربا تھے، نہ رہنے کی کوئی جگہ تھی اور نہ کرنے کو کوئی کام تھا۔ ان کے پاس اپنے کوئی ذرائع نہ تھے اور دوسروں کی مدد کو وہ تامل اور تردد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ بڑے بڑے شہروں کے تاریک کھنڈرات میں بھٹکتے ہوئے اب تک ایک انتہائی غیر متعین اور بھیانک مستقبل کے منتظر ہیں۔ یہ ہمارا تشویشناک ترین قومی مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں کو توڑ دیا گیا ہے۔ باشندوں کو غیر نازی بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے ردِ عمل میں نئی پارٹیاں وجود میں آئی ہیں جو باہمد گر برسرِ پیکار رہیں۔

اس کے بعد سکے کی قیمت میں کمی (DEVALOATION) واقع ہوئی اور مارکٹ کچھ سہارا پا کر آزاد ہو گئی۔ ہر ایک چیز بآسانی دستیاب ہونے لگی۔ زندگی کے ظاہری آثار نمودار ہونے لگے۔ لیکن طبیعتیں جو مصائب کی عادی ہو چکی تھیں وہ ان تغیرات کو بآسانی نہ اپنا سکیں۔ غالباً اسی وجہ سے تفریح اور دل لگی کے عجیب و غریب اور بعض اوقات بڑے مکروہ طریقے ایجاد ہوئے۔ چنانچہ اب بھی اُن جگہوں پر لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے جہاں یہ نام نہاد "مفرحات" پیش کیے جاتے ہیں۔ اس میں بڑی حد تک اُن زرا ندوزوں کا ہاتھ ہے جن کا انتہائی زور اس امر پر صرف ہو رہا ہے کہ دیرینہ روایات کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ لیکن یہ ایک عارضی صورت حال ہے اور

توازن و اعتدال اور نئے مقاصد اور نصب العین کی تلاش کے آثار نظر آنے لگے ہیں، اسی تلاش میں قدیم اقدار کو بھی مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تلاشِ حق کے لئے یہ گرم جوشی اور ولولہ اگرچہ ابھی ایک مبہم اور غیر معین صورت میں ہے تاہم اس کی قوت اور اس کے خلوص کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اس وقت جرمن ریاست کی تعمیرِ نو کا مرحلہ درپیش ہے اور ایک نوخیز قوم کے دوبارہ احیاء کا آغاز ہو رہا ہے، اس لئے اس وقت نئی اقدار کے قبول کئے جانے کا زیادہ امکان ہے۔ جرمنوں کی یہ آمادگی اور یہ میلان اتنا نمایاں ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اس سے استفادے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں چنانچہ یورپ والوں کا یوروپ ہاؤس، امریکہ والوں کا امریکہ ہاؤس اور انگریزوں کا برج (BRIDGE) موجود ہے جہاں پر یہ لوگ اپنے تہذیبی تصورات کو نوعمر اور مشتاق حاضرین کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان اداروں کے ساتھ دارالمطالعے اور لائبریریاں موجود ہیں، جہاں گانوں، تقریروں، مباحثوں، فلمی تصویروں اور نمائشوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان اداروں میں سے اکثر کو تقویت نوجوانوں ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ فطرت کا قاعدہ ہے کہ غنچے روشنی کی سمت ہی اگتے اور کھلتے ہیں اس میں بھی شک نہیں کہ پرانی اقدار چونکہ مغلوب ہو چکی ہیں اور بہر حالت میں صحیح ثابت نہیں ہوئیں، اس لئے جوان نسل شکی مزاج ہو گئی ہے اور نئی اقدار جو مختلف گوشوں سے اُن کے سامنے پیش کی جارہی ہیں اُن کے بارے میں بڑی چھان بین کی جاتی ہے۔

موجودہ ذہنیت دنیا کے تازہ ترین واقعات نے ہر شخص کے ذہنی جوہر کو، جیسا کچھ بھی وہ اس میں تھا، بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ ذہنی فضا میں سے اس وقت سب سے نمایاں خصوصیت "خوف" ہے ——— اس کا خوف کہ کہیں نئی جنگ نہ چھڑ جائے، کہیں تہذیبی، سیاسی اور معاشی حالات پہلے سے بدتر یا بالکل ابتر نہ ہو جائیں، کہیں تازہ مقاصد تک رسائی میں پھر ناکامی نہ ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی خدا کا وجود ہی نہ ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر چیز ایک اندھے بہرے ارادے کے رحم و کرم پر ہو۔ ایسے ہی جذبات کی بنا پر خودکشی کے واقعات آئے دن رونما ہو رہے ہیں۔ دورانِ خون کی زیادتی، حرکتِ قلب کا یکایک بند ہو جانا، اعصابی تکالیف، ہسٹیریا اور اسی قسم کے دوسرے امراض نہایت کثرت سے پھیل رہے ہیں۔ اس کی اصل وجہ وہی "خوف" اور "ہول" ہے جو مختلف صورتوں میں دلوں پر طاری ہے۔ بہت سے لوگ تند مزاج، قنوطی یا بے حس ہو جاتے ہیں۔ بعض

لوگ ہر چیز کا انکار کرنے لگتے ہیں۔ بعض اپنے نظریہ ہائے حیات کے کھوکھلے پن کو ذہن سے محو کرنے کے لیٔے مختلف کاموں میں شدتِ انہماک سے حصہ لیتے ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک ہیجان انگیز مشغلے کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرتے رہتے ہیں، کہ کہیں زندگی کی کسی ایسی تلخ حقیقت سے دوچار نہ ہونا پڑے جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بے بس پائیں۔ اُن کا یہ رویہ بعض مرتبہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور ان کے ذہنی نشوونما کو بہت صدمہ پہنچتا ہے اور اس میں ترقی کے بجائے تنزل شروع ہو جاتا ہے اگرچہ لوگ حق کی روشنی کے لیٔے بے تاب ہیں لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو الہامی اقدار کا علم رکھتے ہوں۔

جرمنی کے کلیساؤں کی موجودہ حالت

کلیسا اپنے اپنے ریوڑ کی منتشر اور سرکش بھیڑوں کو باڑوں کے اندر رکھنے کے لیٔے پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ سوائے چند مستثنیات کے لوگ چرچ میں کسی ذہنی اور عقلی وابستگی کی وجہ سے نہیں بلکہ روایاتی بندھنوں کی وجہ سے آتے ہیں۔ باضابطہ عیسائی کہلانے والوں میں سے بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو وجودِ باری اور مذہب کے بارے میں اپنے عقائد کو کسی کے سامنے دلائل سے صحیح ثابت کر سکیں۔ میں نے یہ کبھی بھی نہیں سنا کہ کسی پادری نے لوگوں کے سامنے ایسے دلائل کی وضاحت کی ہو۔ بائبل کے اقتباسات کو وہ روایتی انداز میں باربار پڑھتے رہتے ہیں لیکن اپنی تبلیغ کا آغاز ہمیشہ اس غلط مفروضے سے کرتے ہیں کہ ان کے سامعین خدا پر پختگی یقین رکھتے ہیں اور بائبل کو خدا کا واحد کلام سمجھتے ہیں۔ میں اس طرح کے وعظوں میں خود حاضر ہوا ہوں۔ اُن کا انداز استدلالی نہیں بلکہ تحکمانہ ہوتا ہے اور سننے والوں کا ذہن کبھی اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک تازہ چرچ کانفرنس میں اربابِ کلیسا نے بلا تامل یہ تسلیم کیا ہے کہ باقاعدہ عیسائیوں اور کلیسا میں حاضری دینے والوں میں سے صرف چند فی صد ایسے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں مسیحی شمار کیا جا سکتا ہے۔ پادری اس صورتِ حال کی تبدیلی اور عیسائیت کے احیاء کے لیٔے کوشاں ہیں۔ شمالی جرمنی میں (EVANGELICAL CHURCH) کسی حد تک اظہارِ رائے کی آزادی دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے پیرو کھلم کھلا "کلیسائیت" سے بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ "ہمیں اس کا یقین نہیں کہ پادری جن نظریات کی ہم کو تبلیغ کرتے ہیں آیا وہ خود بھی ان پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں!" نوجوان خصوصاً مسیحی تصورات کے بارے میں شک میں مبتلا

ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ افسوسناک چیز یہ ہے کہ جب روایاتِ قدیمہ پر مبنی اعتقاد متزلزل ہوتا ہے اور کوئی نیا عقیدہ اس کی جگہ نہیں لیتا تو ایک خطرناک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں یا تو آدمی متروک روایات پر ایمان رکھنے کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے جو ریاکاری اور نفاق پر مبنی ہوتا ہے یا دیانتداری سے اُن روایات کو جھٹلا دیتا ہے اور اس حالت میں نہ اسے کوئی نئی روشنی نصیب ہوتی ہے اور نہ وہ پُرانی تاریکیوں کو قبول کر سکتا ہے۔ جنوب مغربی جرمنی کا رومن کیتھولک چرچ اپنے پیروؤں پر نسبتہً زیادہ اثر رکھتا ہے حالانکہ اُس کے معتقدات دلائل و حقائق سے بعید تر ہیں۔ پوپ اور اُس کے نائبین عظیم جلسہ بازیوں، ہنگامہ پرستیوں اور غوغا آرائیوں سے اپنے گلوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حال ہی میں مقدس سال کا اہم ترین فرمان اس واقعہ کے بارے میں جاری کیا گیا ہے کہ مریم ——— مادرِ خدا ——— اپنے جسد و روح کے ساتھ بنفسِ نفیس خدا کے ہاں تشریف لے گئی ہیں۔ جب اس کے متعلق فلمی مناظر یہاں ہیمبرگ میں دکھائے جا رہے تھے تو لوگ ان کا علانیہ مذاق اڑا رہے تھے۔ بہرحال ان فلموں میں ہزاروں آدمیوں کے مجمعے پوپ کے محل کے سامنے فرمان کے منتظر سمعاً و طاعۃً کھڑے دکھائے جاتے ہیں۔ کیتھولک چرچ کی پشت پر EVANGELICAL CHURCH کی نسبت مضبوط تر اسناد و روایات ہیں اور اُس کے بہت سے پیرو اُن سے نسلی اور موروثی وابستگی رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں کے سامنے یکساں قسم کی مشکلات ہیں۔ بس اتنا ہے کہ بہت سے لوگ اپنے خالق سے رابطہ قائم کرنے کا واحد وسیلہ کلیساؤں کو سمجھتے ہیں اس لئے وہ اسے تھوڑی بہت تسکین کا ہی ذریعہ سمجھ کر اس سے پیوستہ ہیں ورنہ کلیسا ذہنی طمانیت اور تربیتِ اخلاق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے پیروؤں میں اضافے کا انحصار فقط توالد و تناسل پر ہے۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ مشنریوں نے صحیح معنوں میں یہاں کوئی کام کیا ہو۔ اپنے نام لیواؤں، اور اُن میں سے خصوصاً نوجوانوں کو سمیٹ کر رکھنے کے لئے کلیسا خاص طور پر موسیقی کلب، سیر و سیاحت، تفریحی دوروں اور پارٹیوں کا انتظام کرتے ہیں۔ اب 'مذہبی فلموں' کو بھی آزمایا جا رہا ہے۔ ان فلموں کی بنا کسی تازہ ایمانی کیفیت پر نہیں ہوتی بلکہ پرانے مذہبی افسانوں پر ہوتی ہے اُن سے قطعاً یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ایمان اور ایمان کی کوئی متعین صورت انسان کے لئے ضروری ہے۔ نوجوان خدا کے وجود کے لئے دلائل و شواہد چاہتے ہیں۔ وہ ذاتی تحقیق اور اطمینان کے واسطے سے ایمان کی دولت حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔ وہ ان حدود و قیود سے متنفر ہیں جو کلیساؤں نے دوسرے مذاہب کے خلاف قائم کر رکھی ہیں وہ خدا کے نام پر تحزّب، فرقہ بندی اور عدم رواداری سے متنفر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مذہب اور سائنس، خالق اور مخلوق میں کامل رفاقت ہو۔ وہ تمام انسانوں سے محبت اور تعاون علی البر کا رویہ رکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ کلیسا ان کے سامنے یہ نصب العین نہیں رکھتے اور اس کے ساتھ اس کے بھی مدعی ہیں کہ صرف انھی کے پاس ان مسائل کا صحیح جواب ہے، اس لئے طالبینِ حق چرچ اور اس کے خداوند سے دور بھاگتے ہیں، درانحالیکہ اُس کے اندر اپنے خدا کی خالص طلب موجود ہوتی ہے۔

خلاصۂ بحث

جرمنوں کی اکثریت میں خصوصاً ان کی نوجوان نسل میں اگرچہ اس وقت تمام سلبی اور منفی عوامل کارفرما ہیں، تاہم ان کے اندر ایک نئے نصب العین کی شدید طلب اور جستجو موجود ہے ـــــ ایک ایسا نصب العین جو انھیں طمانیت، مسرت اور مقدس فرائض کی انجام دہی میں محو کر دے۔ وہ خالق کائنات تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک صحت مند اور متوازن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے باطنی اور روحانی قویٰ کے فطری نشوونما کے خواہش مند ہیں۔ وہ حقائق کا سبق آموز مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پیش قدمی کے لئے ہموار اور ریختہ زمین کی تلاش میں ہیں۔ اپنوں میں سے یا اغیار میں سے جو کوئی بھی انھیں اپنے کسی مخلصانہ قول و فعل کے ذریعے سے خیرسگالی یا اعانت کی پیشکش کرے اُسے وہ خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ محتاط بھی ہیں اور قدرتی طور پر سائنس کی طرف زیادہ متوجہ ہیں، کیونکہ اس کی معلومات اُن کے نزدیک حقائق ہیں۔ علوم طبیعی سے اُن کو غایت درجہ شغف ہے۔ یونیورسٹیاں، ہائی اسکول اور حلقہ ہائے مطالعہ طلبہ سے بھرپور رہتے ہیں۔ بہت سے طلبہ اور طالبات کو انتہائی ناسازگار حالات میں تعلیم کے لئے فیس کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب علم برائے علم کے قائل نہیں ہیں بلکہ اکثر اس طرح اپنی روحانی تشنگی کے بجھانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ سائنس کے قوانین میں انھیں اللہ کی مشیت کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انھیں اس سے تسکین نصیب ہوتی ہے کہ وہ ایسے راستے پر گامزن ہیں جو ان کے خدا تک پہنچتا ہے۔

اسلام اور جرمنی

اسلام کے بارے میں معلومات

لوگوں کو اسلام کے بارے میں بہت ہی کم معلومات ہیں۔ اس صورت حال کے ذمہ دار بعض خود غرض عناصر ہیں۔ اسلام کے بارے میں لوگوں کے بڑے غلط اور گمراہ کن تصورات ہیں جو غلط معلومات، متعصبانہ تحریروں، تقریروں اور بے جا روایتی قیود کا نتیجہ ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو سرے سے ایک الہامی دین ہی نہیں سمجھتے، کیونکہ کلیسا مسلمانوں کو اب تک "بے دین" HEATHENS کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اشاعتِ اسلام کی تازہ کوششیں

۱۹۴۵ء کے بعد جب مسلمانوں نے اپنا کام دوبارہ شروع کیا اور اسلام کے نظریۂ حیات اور اصولِ سائنس میں کامل تطابق ثابت کرنے کی کوشش کی تو لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ مسلمانوں کی کامیابی نے پوپ کو بھی چونکا دیا اور اس نے ، نومبر ۱۹۴۹ء کو اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ اسلام کی اشاعت کو روکنے کے لئے گڑ گڑا کر دعائیں مانگیں لیکن اسلام کی اشاعت نہ رک سکی بلکہ تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اپنی قوم کی ذہنیت، اس کی الجھنوں، اس کی امنگوں، اور اس کے خدشات کو اچھی طرح جانتے تھے، اُن کے پیچیدہ اسباب و نتائج کا تجزیہ اسلامی نقطۂ نظر سے صرف ایسے ہی افراد کر سکتے تھے جو ان حالات کا شخصی طور پر سالہا سال تک مشاہدہ کرتے رہے ہوں۔ یہ صرف ہمیں ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ کس طرح اپنے لوگوں کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر ان کی وہ خدمت انجام دی جا سکتی ہے جو ہمارے پروردگار نے ہمارے سپرد کی ہے اور کس طرح انھیں ایک فطری ارتقا کی راہ پر ڈالا جا سکتا ہے۔ اب ہماری بنیاد مستحکم اور سرکاری حیثیت سے تسلیم شدہ ہے۔ اندرونِ ملک، و بیرونِ ملک ہمارے متعدد مخلص اور ذی اثر احباب ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں جو باقاعدہ مسلمان نہیں ہوئے ہیں، بلکہ کاغذات کے اندر عیسائی ہی درج ہیں، لیکن وہ کسی وقت کے منتظر ہیں کہ پورے طور پر کھل کر میدان میں آجائیں، اُن کے خیال میں خالق ومخلوق کے درمیان [illegible] رشتہ ہے، ہم انہیں صحیح اور سچی جستجو، اسلامی اور سائنٹیفک معلومات دے سکتے ہیں اور ان کے دل و دماغ کی تسکین کا سامان پیدا کر سکتے ہیں۔ جو لوگ پہلے شک اور تردد میں مبتلا تھے ان کا

جب ان حقائق سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپیاں بڑھتی اور ربط کی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد محبت، اعتماد، افہام وتفہیم اور آخر کار عملی تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ہمارا کام

ہم اب وسیع پیمانے پر پورے جرمنی کے لئے ایک "مرکزِ اسلامی" کی تشکیل کر رہے ہیں۔ اس کا آغاز نہایت کامیابی کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ہم اسلام کے بارے میں معلومات چاہنے والے ہر فرد، جماعت یا تحریک کے سامنے اسلام سے متعلق پوری معلومات بلا کم وکاست پیش کر رہے ہیں، ہر مسلمان جو جرمنی یا باہر سے ہمارے پاس آتا ہے ہم اُسے ہر طرح کی امداد اور مشورہ بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح اپنے ملکی اور غیر ملکی مسلمانوں اور اسلام سے دلچسپی رکھنے والے بھائیوں کے لئے ہم تحصیل علم اور سائنس کے مطالعے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جرمنی بھر میں دورے، خطابات اور طلبہ واساتذہ سے مذاکرات بھی ہوتے ہیں۔ لٹریچر اور اخلاقی فلموں کا بھی انتظام کر لیا گیا ہے۔ ہمارے ایک مہربان فلم ساز نے متعدد فلمیں سائنس اور علوم اجتماعی سے متعلق تیار کر کے دی ہیں۔ ان میں قوانینِ طبعی کو کرشمہ ہائے قدرت کے رنگ میں دکھا کر وجودِ باری کے اثبات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ یہاں اور باہر کے بعض نیک دل حضرات اس کام میں پورا تعاون کر رہے ہیں۔ غرض ہمارے پیشِ نظر تمام دنیا کے مسلمانوں اور اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کی فلاح وبہبود ہے۔ عالمِ اسلام کے وقار اور قدر ومنزلت میں اضافے کے لئے جدوجہد کرنا ہمارا خصوصی اور خوشگوار فریضہ ہے۔ ہم بے غرضی، دیانت اور خلوص کے ساتھ صحیح اسلامی افکار وتصورات کی اشاعت اور وکالت کر رہے ہیں۔ ہم اسلامی دنیا کے ہر فرد کی خدمت کے لئے تیار ہیں اور ہم اسلام کی ذہنی اور علمی امامت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ امامت جس کا ہر سچا مسلمان علمبردار ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو۔

ہمارے کام کی اہمیت

یہ ایک نہایت ہی اہم کام ہے جو یہاں کے اور متعدد مسلمان ملکوں کے اداروں کی مدد سے کیا جا رہا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے اندر اسلام سے دلچسپی اور محبت پیدا ہو رہی ہے جو اب تک گمراہ کن معلومات کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں سے روگرداں تھے۔ ہمارے کام کی اہمیت کا احساس یہاں دن بدن بڑھ رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسی سچی اخوت کی بنا پر اقوام عالم

ایک دوسرے سے قریب تر آ سکتی ہیں۔ ہم آپ سے اور دیگر اسلامی ممالک کے افراد اور اداروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہماری طرف تعاون و اعانت کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کام کی افادیت سے انکار نہ ہوگا۔ اسی میں اللہ کی رضا اور انسان کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ میری استدعا آپ سے یہ ہے کہ آپ اپنی شخصیت کے وزن اور اثر کو اس کام کی تقویت کے لئے استعمال کریں جو اسلام کے لئے اس خطۂ زمین میں ہو رہا ہے۔ آپ کے لئے اور آپ کے اسلام پسند ہم وطنوں کے لئے بھی اس کام کی اتنی ہی قدر و قیمت ہے جتنی کہ ہمارے لئے ہے۔ آپ اپنے ملک کے باشندوں کو ہمارے کام سے مطلع کریں اور ان کو توجہ دلائیں کہ وہ ہم سے ربط قائم کریں اور اپنی تجاویز اور مشوروں سے ارسال فرمائیں۔ اگر وہ محض دعائے خیر اور خیر خواہانہ جذبات ہی سے ہمیں سرفراز کریں تو بھی ہماری نگاہ میں اس کی بڑی وقعت ہوگی۔ دوسری طرف ہم بھی آپ کی ہر طرح خدمت کے لئے تیار رہیں۔ آپ کی طرف سے اسلام سے متعلق، آپ کی ذات، جماعت یا آپ کے ملک کے متعلق ہر طرح کی معلومات کا خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ جانبین کے گہرے ربط و ضبط ہی کے ذریعے سے سچی رفاقت کی بنیاد استوار ہوگی۔ یہاں کے لوگ ان امور میں بہت دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے رفقاء کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں تو اس سے ہمیں بہت خوشی ہوگی۔

آپ کی ہمدردی کی ضرورت و اہمیت

اگر آپ اور آپ کے احباب اپنے ذاتی خطوط میں چند کلمات خیر سے ہی ہمیں خطاب فرمائیں تو ہم اس کی تہِ دل سے قدر کریں گے۔ ہمارے ہمدردوں کے اضافے سے ہمارے یہاں کے کام کے وقار و درتاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب یہاں کے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ باہر کے مسلمان بھائی دل و جان سے ہمارے کام میں دلچسپی لے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بے تاب دلوں کو اسلام کی روحانی غذا نصیب ہو تو یہاں اسلام کے ظہور اور غلبے کے امکانات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ پھر ہماری یہاں کی کامیابی کا پرتو آپ کے وہاں کے کام پر بھی انشاء اللہ ضرور پڑے گا اور آخر کار اس کا فائدہ پوری اسلامی دنیا کو پہنچے گا۔ غرض میں آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں اور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کون لوگ ہماری اس بے لوث خدمت سے دلچسپی اور محبت رکھتے ہیں۔ میں اسلام کی راہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے رشتۂ الفت قائم کرنا چاہتا ہوں اور میری یہ الفت اتنی وسیع ہوگی جتنی وسیع خود کائنات ہے۔

خالقِ کائنات اور قادرِ مطلق کے لئے کامل سمع وطاعت کا رویہ رکھتے ہوئے ہی ہم اپنی شخصیتوں کی تکمیل کرسکتے ہیں۔

اگر آپ کے اور ہمارے درمیان یہ جذبۂ رفاقت قائم رہے بلکہ آخری ممکنہ حد تک نشوونما پاتا رہے تو میں اسے آپ کی عنایت شمار کروں گا۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ رابطہ رکھنے اور اپنے کام کی رفتار کی وقتاً فوقتاً رپورٹ بھیجنے کی اجازت دیں، تو یہ امر میرے لئے موجبِ مسرت ہوگا۔ ہم اپنے کام میں اپنی زندگی اور اس کے وسائل کو پوری خوشی اور نفس کی آمادگی کے ساتھ لگا رہے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ خود اللہ کا فضل وکرم ہمارے شاملِ حال ہے اور سمع وطاعت کا جذبہ جب تک ہمارے اندر کام کرتا رہے گا ہمارے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ جذبہ مرتے دم تک کارفرما رہے۔

عبدالرحمان روسلر

FRANZ ERICH ABDURRAHMAN ROSELER TREMSBUTTLERWE 57

BARGTEHEIDE I. HOLST. BRITISH ZONE (GERMANY.)

(بقیہ صفحہ ۱۳۶) تنقید کرنے میں جو آزادی برتی، اُسی آزادیٔ تنقید کو اپنی جماعت میں بھی برقرار رکھا تاکہ جماعت کے اندر جہاں جو خرابی بھی موجود ہو، اس کی بروقت نشاندہی ہوجائے اور اسے دور کرنے کی کوشش کی جاسکے۔ جماعت کے ہر شخص کو محض تنقید کا حق ہی حاصل نہیں ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے کہ کسی خرابی کو محسوس کرکے خاموش نہ رہ جائے۔ یہ بات ہر رکنِ جماعت کے اجتماعی فرائض میں داخل ہے کہ اپنے ساتھی ارکان کی ذات میں، یا ان کے جماعتی کردار میں، یا اپنی جماعت کے نظم میں، یا جماعت کے لیڈروں میں اگر وہ کوئی نقص پائے تو اسے بلاتکلف بیان کرے اور اصلاح کی دعوت دے۔ اسی طرح جن لوگوں پر تنقید کی جائے ان کو بھی اس بات کا عادی بنایا گیا ہے کہ وہ نہ صرف تنقید کو برداشت کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں، اور جس نقص کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اگر واقعی موجود ہو تو اسے دور کرنے کی طرف توجہ کریں ورنہ تنقید کرنے والے کی غلط فہمی رفع کردیں۔ اس معاملہ میں تنقید کے جائز حدود اور معقول طریقے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بسا اوقات غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور ان کا کچھ نہ کچھ نقصان بھی ہمیں اٹھانا پڑا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم نے کبھی جماعت میں روحِ تنقید کو خوابیدہ ہونے نہ دیا، اور اسی کا یہ فائدہ ہے کہ جماعت کا ہر فرد پوری جماعت کی تربیت اور تکمیل میں مدد دے رہا ہے اور اپنی تکمیل وتربیت میں اس سے مدد پا رہا ہے۔

مطبوعات

(افسوس ہے کہ اس مرتبہ کتابوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بجائے محض ایک سرسری نگاہ ڈال کر ریویو درج کئے جا رہے ہیں۔ ادھر تو کتابوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے اور ادھر مصروفیات کا ایک ہجوم ہے۔ اندریں حال ریویو کا حق ادا نہ ہو سکے گا، لیکن پھر بھی جو رائے عرض کی جا رہی ہے، احتیاط کے ساتھ عرض کی جا رہی ہے، اور بہرحال ہمیں کوتاہیوں سے بچانے والا خود اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ادارہ)

"الفرقان" حج نمبر

بہ ادارت: جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی۔
مقامِ اشاعت: دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ۔
قیمت: عمر (قیمت عام نمبر فی کاپی ۸ر) چندہ سالانہ صہ۔

الفرقان ایک مقصدی دینی جریدہ ہے اور اس سے پہلے بعض بعض بہا خاص نمبر پیش کر چکا ہے۔ ان خاص نمبروں میں سے ایک حج نمبر بھی تھا جس کی مقبولیت و افادیت نے ادارے کو مجبور کیا ہے کہ وہ حج نمبر کو مزید بہتر بنا کر دوبارہ شائع کرے۔

اس خاص نمبر کا آغاز "نگاہِ اولین" کے عنوان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بیش قیمت مقالے سے ہوا ہے پھر مولانا حسین احمد مدنی کا ایک خط "سفرِ عشق" کے نام سے سامنے آتا ہے جو مولانا موصوف نے آج سے بائیس برس پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے سفرِ حج کے موقع پر لکھا تھا۔ اس خط میں عبودیت کے جذبے کا گہرا اثر نمایاں ہے۔ اس کے بعد مولانا محمد اویس ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے سفرنامہ ہائے حج درج ہیں جن میں معلومات بھی ہیں اور جذبات بھی۔

پھر خاص نمبر حج لے نام مولانا منظور صاحب نعمانی، مدیر الفرقان نے ایک خاص پیغام درج فرمایا ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ حج کس طرح کریں! پیغام محبت بھرا ہے، طرزِ تخاطب میں اخوت کی روح بول رہی ہے، اور تمام ضروریات سفرِ حج کے بارے میں مشورے دینے کے علاوہ مولانا نے ضروریاتِ دینی و شرعی کے

بارے میں پوری پوری رہنمائی فرمائی ہے۔ کاش کہ مولانا کا یہ پیغام ایک اور پہلو بھی نمایاں طور پر ساتھ لئے ہوئے چلتا (اگرچہ اس سے بالکل صرفِ نظر بھی نہیں کیا گیا ہے) کہ حج سے لوٹو تو کیا ساتھ لے کر لوٹو، حج کے بعد تم کو اپنی زندگی کن مقاصد میں لگانی ہے، جو سرمایۂ عبودیت کما کے لارہے ہو اسے آخر کس "کاروبار" میں لگانا ہے، جس ماحول کو حج پر جاتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے تھے اس کی طرف لوٹتے ہوئے اس کے بدلنے کے لئے کیا عزائم لے کر لوٹنا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی دکن نے اپنے مخصوص رنگ میں "اسرارِ حج" کے عنوان سے اپنے خاص تاثرات بیان فرمائے ہیں۔

علاوہ بریں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔

مجموعی طور پر اس نمبر کا مقصد یہ ہے کہ حج کا شوق پھیلے، اسے صحت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام ہو، اور اس کا خارجی ڈھانچہ ہی مطابقِ شریعت نہ ہو بلکہ اس کے اندر مطلوبہ روح بھی موجود ہو۔

القول المختار فی ما ورد فی النبی المختار

مؤلفہ: جناب عنایت اللہ صاحب اثری وزیرآبادی (مدرس دارالحدیث، گجرات پنجاب)

ملنے کا پتہ: جناب مؤلف سے طلب کیجئے۔

قیمت: ایک روپیہ فی جلد

یہ کتاب فنِ تاویل و مناظرہ میں ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ آیات و احادیث کی تفسیر و شرح میں نادانی و غلط فہمی کی وجہ سے ایسی جتنی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن کی آڑ لے کر نبی صلعم یا آپ کے صحاب اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق مخالفین فضول گوئی کرتے ہیں ان کو صاف کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے قرآن و حدیث کے بہت سے اہم مقامات کی تمام ممکن تاویلوں کو سامنے لا کر ان میں واضح اور بہترین تاویل کو اہم وجوہ کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ کتاب کے طرزِ تحریر میں فنِ تاویل و مناظرہ کی قدیم روایات کو محفوظ رکھا گیا ہے، بلکہ کتاب کے تسمیہ اور اس کی طباعت وغیرہ میں بھی!

البیان المختار فی ما ورد من انباء الرسل الاخیار

مولفہ: جناب عنایت اللہ صاحب اثری وزیر آبادی (مدرس دار الحدیث، گجرات، پنجاب)

ملنے کا پتہ: جناب مولف سے طلب کیجئے۔

قیمت: فی جلد دو روپے۔

یہ کتاب بھی فن تاویل و مناظرہ ہی سے تعلق رکھتی ہے، اور اس میں جملہ انبیا و مرسلین کے بارے میں ان غلط فہمیوں کو صاف کیا گیا ہے جو کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح میں غلط باتوں کے شامل ہو جانے سے پیدا ہو گئی ہیں۔

PAKISTAN THE ISLAMICE STATE

مرتبہ: جناب ایم، اے، مجید صدیقی ایم، اے۔

شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز، ۳۴، نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور۔

قیمت: فی جلد پانچ روپے آٹھ آنے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ "عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد" بڑی وسیع صداقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر شر خیر کو نمود دینے کا ذریعہ بن جاتا ہے آج سے پہلے اسلامیات پر جتنا بھی علمی و تحقیقی لٹریچر پیدا ہوا ہے اس کا ۹۰ فی صدی حصہ ایسا ہے جو مخالفِ اسلام قوتوں کی تحریک سے وجود میں آیا ہے ہماری بے شمار قدیم سیاسی کتابیں ایسی ہیں کہ اگر خوارج، روافض، اہلِ بدعت، خلقِ قرآن کے موجد اور دوسرے گمراہ فرقے اپنے خیالات نہ پھیلاتے تو ان کے لکھے جانے کی کوئی وجہ نہ ہوتی اور آج ہم ان سے محروم ہوتے۔ بالکل اسی اصول پر ہمارے حکمران طبقہ کی "دستوری سفارشات" کا شر بہت بڑے پیمانے پر دنیائے علم میں خیر کی افزائش کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت کے متعلق متعدد کتابیں، رسائل اور دستوری خاکے محض ان سفارشات کی تحریک سے وجود میں آئے ہیں۔ پیشِ نظر مجموعۂ مقالات بھی انھیں چیزوں میں شامل ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مقالہ خود مرتب کا ہے جس میں جدید نظامِ ریاست اور اسلامی ریاست پر قلم اٹھایا گیا ہے اور اس کے بعد ایک دستوری خاکہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ دوسرا بیش قیمت مقالہ ڈاکٹر ایم عزیز احمد (پنجاب یونیورسٹی) کے قلم سے "اسلامی نظریۂ سیاست کا مزاج" کے عنوان سے ہے۔ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" کے عنوان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا مشہور مقالہ درج ہے۔ "اسلام میں انتخابِ خلیفہ" کے

موضوع پر ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کا مضمون پیش کیا گیا ہے۔ ان مقالات کے ساتھ قرار دادِ مقاصد اور اس کے محرک جناب لیاقت علی خان صاحب کی تحریکی تقریر بھی جمع کر دی گئی ہے تاکہ اسلامی اصولِ سیاست کی روشنی میں اس فاصلے کو ناپا جا سکے جو قرار دادِ مقاصد اور دستوری سفارشات کے درمیان رکھا گیا ہے۔

تتمہ کے طور پر "مسلم معاشرہ کی اصلاح" کے موضوع پر پرنس سعید حلیم پاشا کا مضمون شریک مجموعہ ہے۔

الطریقۃ السہلۃ

مؤلفہ: ایس، اے، رشید صاحب عربک لکچرار جامعہ عباسیہ بہاولپور۔

ملنے کا پتہ: مؤلف کے علاوہ قومی کتب خانہ چوک بازار بہاولپور سے مل سکتی ہے۔

قیمت: مکمل نصاب دو روپے۔

عربی زبان کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے اچھی قسم کی نصابیات کا خلا پُر کرنے کے لئے برابر کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کوششوں کے متعدد اچھے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ الطریقۃ السہلۃ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مؤلف نے عربی کا کافی ذخیرۂ الفاظ بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس کورس میں قواعد کی تفہیم بہت ہی سادہ طریق پر کی ہے۔ یہ ہم ضرور عرض کریں گے کہ قواعدِ صرف و نحو کے ذریعے زبان سکھانے کا فرسودہ طریق اختیار کرنے کے بجائے اگر تعلیمِ زبان کے ذریعے قواعد صرف و نحو سکھانے کا طریق اختیار کیا جاتا تو تعلیمِ زبان دانی کے اصولوں کے لحاظ سے صحیح تر ہوتا۔ آخر کیوں نہ ایسا ہو کہ عربی کی تعلیم روزمرہ کی ضرورت کے جملوں، کہانیوں، مکالموں اور نظموں کے ذریعے دی جائے اور قواعد کی تعلیم کو اس میں سمو دیا جائے۔ بحالاتِ موجودہ یہ کورس طلبہ کی نفسیات کے لحاظ سے کبھی بھی دلچسپ نہ ہوگا۔ اور جو نصاب دلچسپ نہ ہو وہ سہل بھی نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں کتابت و طباعت کا معیار بھی تعلیمی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔

عربی زبان کے اساتذہ اور بطور خود عربی زبان کا مطالعہ کرنے والے اصحاب اس نصاب کو آزمائیں اور مولف کو مفید مشورے بہم پہنچائیں۔

سلسلۂ مبادیات

مؤلفہ: جناب فروغ علوی کاکوروی ایم، اے، بی، ٹی۔
شائع کردہ: ادارۃ القرآن (مرکز تحریکِ ایمانی) محمد علی لین لکھنؤ۔
قیمت: مکمل سلسلہ ۱۲ ؍

یہ سلسلہ جیبی سائز کے چھوٹے چھوٹے آٹھ پمفلٹوں پر مشتمل ہے۔ ان پمفلٹوں کے عنوانات یہ ہیں (۱) انسانیت کے قیام و استحکام کا دار و مدار مذہب پر ہے (۲) اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں (۳) دین فطرت کا فطری نظام ایمان (۴) اسلام سائنس اور نفسیات کی روشنی میں (۵) قرآن کی روشنی میں ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور و تعلق (۶) دین فطرت ہمارے لئے ناقابلِ عمل کیوں بن گیا (۷) رسول اللہ کا مرتبہ اور منصب (۸) قرآن کی روشنی میں قرآن کی اہمیت۔

یہ رسائل دین کی بنیادی دعوت پر مشتمل ہیں اور سرسری مطالعہ کی بناء پر ہماری رائے یہ ہے کہ مرکزی فکر غیر متوازن نہیں ہے۔

مردِ مومن

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
شائع کردہ: کتاب منزل لاہور
قیمت: مجلد مع رنگین گرد پوش دو روپے چار آنے۔

یہ کتاب پہلے "قرآن اور سیرت سازی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اب اس کا دوسرا ایڈیشن "مردِ مومن" کے نام سے کتاب منزل نے پیش کیا ہے۔ ترجمان القرآن میں اس کے پہلے ایڈیشن پر ریویو ہو چکا ہے۔ لہٰذا کسی تفصیلی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ممتاز علمی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے اندازِ بیان میں فلسفہ، تصوف اور ادبیت تینوں عناصر گندھے ہوئے ہیں۔ آپ عربی الفاظ خصوصاً مصادر بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں جن کی وجہ سے زبان کہیں کہیں ثقیل ہو جاتی ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں آپ نے واضح فرمایا ہے کہ قرآن کس طرح انسانی سیرت کو بناتا ہے۔ کتاب کے تین باب، قرآن اور علاجِ خوف، قرآن اور علاجِ حزن، اور قرآن اور علاجِ غضب خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔ تازہ ایڈیشن بلحاظ دیدہ زیبی پہلے ایڈیشن سے فائق تر ہے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اُصولوں پر قائم کیجا سکتی ہے، ایسا اِقدام کرنے والے گروہ کو کن اُصولوں پر منظم کیا جاسکتا ہے، اور اِن اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جاسکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اِس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں:۔

قیمت حصہ اول ۰-۱۴-۱ ‏ ‏ ‏ حصہ دوم ۰-۸-۲ ‏ ‏ ‏ حصہ سوم ۰-۰-۲

محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ —مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)